غداد کا جوہری

۷۸ء

بغداد کا جوہری

از

جناب اشرف صبوحی صاحب دہلوی

کتب خانہ علم و ادب دہلی

مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

ایک روپیہ (عہ)

مجلد

جملہ حقوق محفوظ ہیں

فہرس

صفحہ

تعارف .... عالیجناب پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی ایم اے۔ آئی ای ایس ۴

پہلا باب ۶

دوسرا باب ۳۳

تیسرا باب ۴۸

چوتھا باب ۶۷

پانچواں باب ۷۴

چھٹا باب ۸۸

ساتواں باب ۱۰۰

آٹھواں باب ۱۱۱

نواں باب ۱۳۱

دسواں باب ۱۴۴

تعارف

از

عالیجناب پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی ایم۔اے۔آئی۔ای۔ایس

اشرف صبوحی صاحب کی خواہش ہے کہ میں ان کی کتاب کے لئے چند الفاظ تمہید یا تعارف کے طور پر لکھوں۔ تمہید کا مقصد عموماً کتاب کے مطلب اور موضوع کو واضح کرنا ہوتا ہے اور یہ کام مصنف سے بڑھ کر اور کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ رہا تعارف تو ان کی تحریر سے اردو ادب کا ذوق رکھنے والے حضرات بخوبی واقف ہیں کیونکہ اشرف صبوحی صاحب کی کہانیاں اور مضامین اکثر اردو رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں تک میں نے ان کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ مغربی افسانوں کو مشرقی انداز اور اسلوب سے بیان کرنے میں ان کو خاص ملکہ ہے اور انکے ترجموں پر اصلی اور طبعزاد ہونے کا گمان گذرتا ہے۔ اگرچہ ترجمے میں ضرورت سے زیادہ تصرف کو بعض لوگ ناروا خیال کرتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ انگریزی اور اردو افسانوں کے پڑھنے والوں میں باہم کس قدر اختلافِ مذاق ہے اگر اس قسم کے تصرفات سلیقہ کے ساتھ کئے جائیں تو چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔ اشرف صبوحی صاحب کی تحریر کا ایک اور نمایاں وصف دلّی کے محاورات اور روزمرہ کا استعمال ہے جس کو ان کی زباندانی کا ثبوت خیال کیا جا سکتا ہے۔ ایسی زبان اب بہت کم ادیب استعمال کرتے ہیں۔ علّامہ راشد الخیری اس اسلوب کے موجد تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی تحریر بھی اس خاص طرز کا ایک نہایت معتدل اور دلکش

نمونہ تصور ہو سکتی ہے۔ اشرف صبوحی صاحب کو ان بزرگوں کا پیرو سمجھنا چاہئے۔

"بغداد کا جوہری" یعنی پیش نظر افسانہ انگریزی سے اخذ کیا گیا ہے۔ انگریزی میں وہ کسی اور مغربی زبان سے ترجمہ ہوا ہے لیکن اشرف صبوحی صاحب نے اپنے ادبی تصرف سے اس کی ماہیت کو اس طرح تبدیل کر دیا ہے کہ اب اس پر اجنبی ہونے کا گمان بھی نہیں گزرتا۔ قصے کے محاسن کا تذکرہ فضول معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی خوبی کا اندازہ پڑھنے والے خود کر لیں گے۔ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ظاہر میں یہ قصہ الف لیلہ کی ایک داستان نظر آتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ ایک لطیف اور پر معنی تمثیل ہے۔ جس میں فلسفۂ حیات اور فلسفۂ حسن کے بہت سے رموز و نکات پوشیدہ ہیں۔ تاہم قصے کی دلچسپی ان فلسفیانہ نکات کی شرح و تمیز پر منحصر نہیں بلکہ اس کا انحصار مصنف کے خیال کی نزاکت اور بیان کی لطافت پر ہے اور ان صفات کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے اشرف صبوحی صاحب نے جو کاوش کی ہے اس کی پوری داد وہی لوگ دے سکتے ہیں جن کو ترجمے کی دقتوں اور مشکلات کا کبھی خود تجربہ ہوا ہے +

محمد سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

سدا رہے نام اللہ کا۔ خلیفہ حمزہ کے زمانہ حکومت کی باتیں ہیں کہ بغداد میں احمد نام ایک نوجوان جوہری رہتا تھا۔ خدا کی مہربانی ہوتی ہے تو دولت و شہرت کی کیا کمی، روپیہ پیسہ انگنت۔ نوکر چاکر بے شمار۔ مکان بھی محل کا محل، سارے شہر میں شاہی محلات کے علاوہ سب سے زیادہ بڑا اور خوبصورت۔ لیکن یہ جتنی ثروت تھی احمد کے باپ محمود کی بدولت تھی۔ اس نے اپنے وقت میں بڑی سمجھ سے کام لئے تھے اور اب بڑھاپے کے سبب ایک عرصہ سے گوشہ نشین ہو کر اپنا کاروبار بیٹے کو سونپ دیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ بغداد میں جس کو شہر کا منبع کہنا چاہئے اُس کی دکان تھی۔

نوجوان جوہری احمد اکثر بیگمات شاہی کے محلات میں بھی جایا کرتا تھا اور ایک چوکی پر ریشمی کپڑا بچھا کر اپنا مال قرینے سے سجاتا، تاکہ نمائش اچھی طرح ہو سکے۔ خواتین سر سے پا تک برقعوں میں لپٹی ہوئی، منہ پہ گہرے گہرے نقاب ڈالے آتیں۔ زیورات دیکھتیں اور مول تول کرتیں۔ مگر اُن کے مدنظر صرف جواہرات کی خریداری نہ ہوتی بلکہ وہ اس خوبصورت جوہری بچہ کی ملاحت و صباحت کو اپنی دزدیدہ نگاہوں سے پرکھتیں۔ بس نہیں چلتا تھا کہ جواہرات کے بدلے اُس کے حسن و جوانی کو گلے کا ہار بنالیں۔ اِن کے ساتھ آنے والی بعض شوخ و شریر کنیزیں تو قاف کی پریاں یا سیاہ فام حبشنیں، یہاں تک بڑھ جاتیں کہ اپنی مسکراتی ہوئی سریلی آوازوں کی کمندیں

پھینک کر احمد کے دل کو کھینچتیں اور ہم نشینی کی دعوتیں دیتیں۔

احمد پر شباب، دولت اور صنفِ نازک کو برباد کرنے والے حسن کے تین تین نشے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ چوکنے والا کب تھا۔ سوداگری کے پردے میں اس نے عشق و محبت کی خوب داستانیں دہرائیں۔ بیسیوں مرتبہ اسے کمند کے ذریعہ بھاگنا پڑا۔ دیواریں پھاندیں حوضوں میں چھپا۔ موریوں کے راستہ جان بچائی۔ مگر تقدیر کا دھنی تھا ہر دفعہ بچ نکلا۔ بال تک بیکا نہ ہوا۔ اس کی عادت تھی کہ دن بھر ایک پاکباز مسلمان کی طرح نیچی آنکھیں کئے اپنی دکان پر بیٹھا اپنے کاروبار میں مصروف رہتا اور رات کو عشار کی نماز کے بعد سوداگری کے کپڑے اتار سنگ مرمر کے حوض میں معطر پانی سے نہاتا۔ قیمتی ریشمی لباس پہن کر اوپر سے ایک لبادہ کندھوں پر ڈال سرگشت کے لئے نکل کھڑا ہوتا۔

دن میں وہ مقدس صورت اور رات کو یہ رنگین وضع دیکھ کر دیکھنے والے آپس میں کہتے کہ کیا اللہ کی شان ہے، باپ نے کبھی اتنی راحت سے کب بسر کی، بیچارہ دولت سمیٹنے میں ہی گذر گیا۔ زندگی کا خاک لطف نہیں اٹھایا۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ وہ اعراف سے آگے نہ بڑھا اور اسے جیتے جی بہشت کا مزہ مل رہا ہے۔ کونسا عیش ہے جو اسے میسر نہیں، واللہ عورتوں کے ایمان اس کی مٹھی میں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ جتنا لوگ اسے ظاہری چال ڈھال سے حسن کا متوالا اور عشق کا رسیا خیال کرتے تھے۔ اتنا وہ تھا نہیں۔ اسے عورت کی ذات سے نفرت تھی۔ حالانکہ عورتیں اس کے شباب، اس کی دولت، اور اس کے دلکش انداز پر فدا تھیں۔ احمد کو حوا کی بیٹیوں کے مزاج میں تلون نظر آتا۔ وہ ان کی فطرت میں دغابازی پاتا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کاغذ کے خوشنما گلدستے ہیں۔ رنگین مگر بوئے وفا سے خالی۔ انہیں کسی مرد سے محبت نہیں ہو سکتی۔ جو اپنے شوہروں کی آنکھوں میں خاک جھونکیں۔ آشناؤں کے دیدوں میں مرچیں ڈالنا ان سے کیا بعید ہے۔ اسکی رائے تھی کہ عورت جس قدر حسین ہوگی اسی قدر اس کے جذبات گندے ہوں گے وہ محبت

میں بھی روزانہ نئی لذت تلاش کرتی ہے۔ وہ اگر کبھی مغلوب ہوتی ہے تو صرف تعجب و تحیر سے۔ اس لئے احمد کو یہی خوشی کس طرح حاصل ہوتی۔ حسینوں سے چھیڑ چھاڑ کا لپکا کہو یا دیوانی جوانی کا جوش کہ وہ اندھیری راتوں میں خطرات و مہمات کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا۔ اور اس کا بگڑتا بھی کیا تھا۔ ہمت خوشامد اور حسن و جوانی میں اس کے لئے کوئی ندرت نہ تھی۔ حسین سے حسین صورت کو کھلونا سمجھتا۔ جب تک جی چاہا مزے اڑائے، دل بھر گیا الغط۔ وہ اپنے گھر خوش یہ اپنے گھر خوش۔

حُسن کی یہ ستانیاں تو ایک طرف اِن حضرت کو اُن مردوں سے بھی دلی عناد تھا، جو عورتوں کو غالب، اپنے کو مغلوب سمجھتے۔ جن کے مرمریں ایوانوں میں بلوریں فوارے اچھلا کرتے۔ کمروں کی دیواریں صندل کی لکڑی سے منڈھی ہوئی ہوتیں۔ دروازوں پر منقش سونے چاندی کے پترے جڑے ہوتے۔ افریقہ کے چہکنے والے پرندے صحنوں میں اُڑتے پھرتے اور ان کی پرواز کو مقید کرنے کے لئے بال سے باریک سنہری تاروں کا جال تنا رہتا۔ ریشمی قالین جن میں روپہلی ستارے جگمگ کرتے۔ پاؤں کے تلوؤں کو گدگداتے جن کے محلات حسن کی منڈیاں تھیں۔ خواجہ سراؤں کے غول، لونڈیاں، غلام، بیگمات اور حرم ایلے گیلے پھرتے۔

رات کی تاریکی میں احمد کسی چور راستے سے دبے پاؤں ان امرا کے باغوں میں جا پہنچتا اور ان کی روحوں پر ڈاکے ڈالتا۔ یعنی ان کے عشرت کدوں کی عفتیں لوٹتا۔ ایک انسان کی عزت کا مول اس کی روح کے برابر ہے۔ جب روح چوری ہو گئی تو ظاہری شان و شوکت میں بےحیائی کے سوا کیا رہ گیا۔ پھر جب وہ یہ دیکھتا کہ یہی معزز لوگ صبح کو اکڑتے ہوئے شیخ احمد شیخ احمد پکارتے دکان پر آتے اور اپنی منظورِ نظر بیگمات کے لئے جواہرات پسند کرتے اُنہی پاک دامن حُسن کی دیویوں کے لئے جو رات کو اپنی شائیوں کے مقدس بندھن اسی احمد کے ہاتھوں پر توڑنے کے لئے آمادہ ہوتیں تو ذرا انصاف سے کہئے اس کے دل میں

ان کی کیا وقعت رہتی۔ اور اسی سبب سے احمد کو اونچے گھرانے کی عورتوں اور مردوں دونوں سے اللہ واسطے کا بغض سا ہو گیا تھا۔

انسان کیسا ہی بدکردار اور نفس کا غلام سہی، اپنے ہمجنسوں کی تذلیل و تحقیر کے خیال میں ہمہ وقت محو ہو کر بھلا کس طرح خوش رہ سکتا ہے؟ احمد بھی آخر آدمی تھا، مسلمان، قومی درد رکھنے والا، خدا اور رسول سے پھرا ہوا نہیں۔ رفتہ رفتہ اس کے مزاج کی شگفتگی پژمردگی سے بدل گئی۔ اس کی طبیعت میں انقباضی رنگ جھلکنے لگا۔ بزرگ محمود بیٹے کی صورت دیکھتا۔ اس کا احوال سنتا اور اندر ہی اندر کڑھتا کہ جوان بیٹا اپنی جان کو خطرہ میں ڈال رہا ہے، مگر جوانی پر بڑھاپے کا کیا اثر۔ آخر اس نے ایک ترکیب نکالی۔ بیٹے کو حج کے لئے آمادہ کیا۔ حج اسلامی فرائض میں سے ایک بڑا فرض۔ اس پر باپ کا ارشاد احمد تیار ہو گیا۔ خدا کی قدرت زیارت کعبہ کا اس قدر شوق بڑھا کہ نہ موسم کی پروا کی نہ سامان سفر کی فراہمی کا انتظار۔ جس طرح بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور بغداد سے چلنے والے حاجیوں کے پہلے قافلہ کے ساتھ ہو لیا۔ راستہ کے شہروں کی سیر کرتا پہلے مدینہ منورہ پہنچا وہاں کی زیارتوں سے مشرف ہو کر مکہ معظمہ آیا۔ حج کیا اور بڑے اطمینان کے ساتھ گھر کا رُخ کیا۔

تقریباً سات مہینے کی جدائی کے بعد باپ بیٹے ملے تھے۔ حج مسلمانوں کے عقیدہ میں انسانی فطرت کی کسوٹی ہے۔ محمود کو یہ معلوم کرنے کی جلدی تھی کہ احمد کھوٹا پایا کھرا۔ اس لئے اس نے پہلی فرصت میں بیٹے کو اپنے پاس بٹھالیا اور سفر کے حالات پوچھنے شروع کئے۔ راستے کی بستیوں کے تمدنی و معاشرتی حالات کرید کرید کر دریافت کرتا اور باتوں باتوں میں اس کے دل کا ہر گوشہ ٹٹولتا کہ عورتوں سے نفرت و حقارت کا جذبہ بڑھا یا گھٹا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ فرزند دلبند۔ جیسے گنہگار گئے تھے ویسے ہی رہے۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے بے چین ہو کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا "بیٹا! کیا

اللہ نے تمہاری واپسی کے انتظار میں صرف اس لئے مجھے زندہ رکھا تھا کہ میں یہ معلوم کر کے آنسو بہاؤں کہ تم رحمتِ الٰہی کے سزاوار نہیں؟ عزیز من! ابھی وقت ہے اپنے ہوش میں آجاؤ۔ تم بڑے خطرہ میں ہو۔ اگر تمہارے رویہ میں فرق نہ آیا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم اپنی جان نہ کھو بیٹھو۔ دولت۔ جوانی۔ حسن اور چالاکی ہمیشہ امن کا کفیل نہیں رہتی کسی جوکھوں میں پڑ گئے تو یہ بوڑھا باپ بے آئی مر جائیگا۔ جان تو خیر پیدا کرنے والے کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ ہاں میں جو مرتا ہوں تو فقط تمہارے ایمان کے لئے۔ یہ جا کر نہیں آتا۔ ایک مسلمان اور مسلمان کا بیٹا جنت سے محروم! جنت سے محروم رہنے والوں کا حال کیا تم نے کتابِ مقدس میں نہیں پڑھا؟ افسوس! علم، رحم، دینداری اور ابنائے جنس کی عزت کے جذبے تمہارے اندر مطلق نہیں!

محمود یہ تقریر کر رہا تھا اور آنسوؤں کے قطرے اس کی سفید ڈاڑھی پر گر رہے تھے۔ احمد اپنے باپ کی یہ اندوہگیں حالت نہ دیکھ سکا۔ اس کا دل بھر آیا۔ روح کانپ اٹھی۔ باپ کے قدموں پر جھک کر بولا۔ ابا جان! آپ سچ فرماتے ہیں۔ کاش، دوسرے لوگ بھی مجھے آپ کی طرح انسانی لباس میں نظر آتے۔ میرے دل میں ان کی عزت ہوتی اور میرا سر ان کی شرافت کے آگے جھکتا۔ کیا کروں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کافر جادوگر نے خونخوار درندوں، بے حیا جانوروں اور مسخرے بندروں کو ستم ظریفی سے آدمی کی صورت بنا دیا ہے۔

محمود نے اپنے بیٹے کا جواب بڑے غور سے سنا۔ آنسو پونچھے اور کہنے لگا۔ الحمد للہ! معلوم ہوا کہ ابھی تم میں ایمان کی جھلک اور انسانیت کا جوہر باقی ہے۔ تمہاری روح گناہوں کی آلائش میں اتنی زیادہ ملوث نہیں ہوئی کہ تلافی نہ ہو سکے۔ سنو! میں تمہارا باپ ہوں اور میرا فرض ہے کہ تمہیں ان آلودگیوں سے بچنے کا طریق اور نجات کا راستہ بتاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اندھیرے ہی میں روشنی پا سکتے ہو۔ تمہیں صرف ایک

عقلمند اور شریف خاتون ہی کے ذریعہ اپنے توہمات سے چھٹکارا ملے گا۔ اب تم کو چاہیے کہ اپنے لیے ہمنشین تلاش کرو۔ شہر ہر قسم کی لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے۔ جہاں چاہو پیام بھیجو۔ لیکن خیال رہے کہ جس لڑکی پہ نگاہ پڑے تو اس میں نسبی شرافت، حُسنِ دل آویز، سلیقے کے علاوہ حفظِ ناموس اور شوہر پرستی کا جذبہ ضرور ہو۔ عورت کے یہی اوصاف ہیں ایسی عورت تم کو بوالہوسی کے دام فریب سے نکال لے گی۔ ... پاکیزگی اور روح کی خوشی جسے تم نے کھو دیا ہے بس اسی طرح دوبارہ حاصل ہو سکتی ہے۔

احمد نے اپنے باپ کی ان باتوں کو بڑے اچنبھے کے ساتھ سُنا۔ انسان زیادہ بوڑھا ہو کر بچوں کی طرح بھولا ہو جاتا ہے۔ اس کو اپنے باپ کی سادگی اور مکار دنیا سے بے خبری پہ دل میں ہنسی آگئی۔ اس لئے کہ احمد نے اپنی سیاہ کار زندگی میں جو تماشے دیکھے تھے محمود کی پارسا نگاہیں کہاں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ عورت جس قدر بے وفا ہے اسی قدر باوفا بھی۔ اس کی فطرت کسی کے قابو کی نہیں یہ اگر نیک ہے تو کیا مجال کہ بری نظر سے کوئی اس کو دیکھ لے۔ تمام دنیا کی برائیوں کے باوجود شوہر کی پرستاری کرے گی لیکن اگر بگڑ گئی تو پھر نہ بادشاہ کی حکومت نہ سپاہی کی تلوار اسے اپنے ارادہ سے روک سکتی ہے۔ شوہر مجبور ہے۔ ادھر خندق اُدھر کھائی۔ احمد کو ان واقعات کا تجربہ تھا اس لئے باپ کی تجویز اس قدر مضحکہ انگیز معلوم ہوئی کہ محمود کے بڑھاپے کا ادب بھی بھول گیا اور بے تحاشہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ باپ بیٹے کی اس گستاخی کو درگذر کرنے والا کب تھا۔ اس کا چہرہ مارے غصہ کے تمتما اُٹھا۔ احمد باپ کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر فوراً سنبھلا اور ندامت سے سر جھکا کر معافی مانگنے لگا۔

بوڑھے باپ کی جوان بیٹے سے ناراضی کتنی دیر کی۔ دودھ کا ابال، آگ کھینچ لی۔ پانی کا چھینٹا دیا پھر کچھ نہیں۔ جب ذرا اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو احمد نے کہنا شروع کیا۔ ابا جان! آپ شاید اس جن کی کہانی بھول گئے جس نے اپنی ... نظر کو شیشے کے صندوق

۱۲

تہ بند کر کے ایک چھوڑ چار چار فولادی قفل لگا دیئے تھے۔ وہ صندوق کو صندوق کی تہ میں رکھ دیتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی کرنی سے باز نہ آئی۔ بوڑھے تن کی چھاتی پر مونگ ہی دلتی رہی۔ اب بھی کیا آپ کو یقین ہے کہ دنیا میں وفادار عورتیں مل سکتی ہیں؟ محمود نے جواب دیا۔ ”اپنی کہانیاں رہنے دو۔ مجھے دنیا کا تجربہ تم سے زیادہ ہے۔ یاد رکھو، صرف بیویوں ہی کو تم شوہروں سے بیوفائی کا الزام نہیں دے سکتے۔ عورتوں کی اس بُری خصلت کے ذمہ دار ایک بڑی حد تک خود مرد ہیں۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجا کرتی۔ مردوں نے اپنی بیویوں کو گرمی کی پیاس بجھانے والا شربت سمجھا۔ ان کے جذبات کی قدر نہ کی۔ ان کی کمزوریوں میں ایک طاقت تھی۔ انہوں نے بھی اپنے شوہروں کا وہ خزانہ جس کا نام عزت ہے لٹا دیا۔ سمجھے! عورت کی تذلیل درحقیقت مرد کی تذلیل ہے۔ بیوی کو محبت سے بیوی بنایا جائے، زندگی کی دوڑ میں اسے برابر کا شریک سمجھیں تو اپنی عصمت کے ساتھ شوہر کی عزت پر قربان ہونے والا اس سے زیادہ کون ہو سکتا ہے۔ یہ ہندی مثل سُنی ہے یا نہیں کہ ”گھر پت رکھی پت“۔

آدھے دن اور بڑی رات تک باپ بیٹوں میں بحث ہوتی رہی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ مضبوط۔ بوڑھا ڈرائے مرنے سے جوان ڈرائے بھاگنے سے۔ نہ وہ مانے نہ یہ۔ دونوں برابر اپنے نظریوں پر قائم۔ آخر تھک کر ایک نے دوسرے کو شب بخیر کہی، اور اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے گئے۔ خدا جانے نیند آئی یا نہیں۔ خواب دیکھے تو کس قسم کے یا رات آنکھوں ہی میں کٹ گئی۔ صبح کی پو ابھی پھٹنے نہ پائی تھی کہ خدمتگار روتے پیٹتے احمد کی خوابگاہ میں آئے اور خبر دی کہ ”صاحب خانہ اللہ کے گھر سدھارے“۔ جا کر دیکھا تو محمود اپنے بستر پر آرام سے پیر پھیلائے لیٹا ہے۔ چہرہ نورانی بدن ٹھنڈا، آنکھیں بند، ابدی نیند طاری۔ ”سب تعریفیں اسی کے لئے ہیں جسے کبھی نیند آتی ہے نہ اونگھ“۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرنے والے مرحوم کے تعلقات شہر والوں کے ساتھ بہت خوشگوار تھے۔ اتفاقاً اس کے انتقال کا چرچا ہو گیا۔ ایک متمول ہر دلعزیز مسلمان کا جنازہ کندھا دینے والوں کا ایک ٹھکانا تھا۔ بڑی دھوم کی نماز ہوئی۔ میت کو قبر میں اتارا۔ مسافر کو اول منزل پہنچایا۔ احمد پر زندگی بھر میں یہ پہلی افتاد تھی، چپ سکتے کا سا عالم۔ بمشکل لوگ اسے قبرستان سے واپس لائے۔ گھر پہنچا تو گھر کی ہر چیز پر اداسی برس رہی تھی۔ جنازہ کے ہمراہیوں کے کلمہ پڑھنے کی غمگیں آوازیں برابر کانوں میں گونج رہی تھیں۔ پائیں باغ کے خوشنما پھولوں پر بہار کا کیا کام۔ سنگ مرمر کے حوضوں میں بلوریں فوارے آنسو بہاتے معلوم ہوتے تھے۔ پانی میں تیرتی ہوئی لال سبز مچھلیاں۔ ہوا سے اڑنے والی خوشرنگ تیتریاں، خوش الحان پرندوں کے نغمے اب اس کے لئے کیا دلچسپی رکھتے۔

ادھر احمد کی یہ حالت اُدھر اس کا چچا نورالدین گھر کے انتظام میں مشغول۔ کیا دنیا ہے۔ بھائی کا کفن ابھی میلا نہیں ہوا کہ دل میلے کئے جانے لگے۔ لونڈیاں فروخت کرنے کی غرض سے چوک بھیجی گئیں۔ حرموں سے کہدیا اپنا اپنا ٹھکانہ تلاش کریں۔ منکوحہ بیویوں میں احمد کی ماں مر چکی تھی۔ دوسری فاطمہ جسے مرحوم بہت چاہتا تھا دلدرہی۔ اس کا بڑا پاپ تھا۔ کون پوچھتا؟ تیسری عائشہ اس میں ابھی جوانی کے کس بل موجود تھے۔ نورالدین نے ایک بھائی اور ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کو ہمدردی کے ساتھ خچر پر سوار کیا اور اپنے گھر لے گیا۔ بھائی بھائی کی بیوہ کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔ جس وقت یہ نقاب پوش رخصت ہو رہی تھی اس کا جسم سسکیوں کے مارے لرز رہا تھا اور اس کے پیچھے کچھ سوگوار آہستہ آہستہ کلمہ پڑھتے روتے جا رہے تھے۔ احمد نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سلام کیا اور دل میں کہا: "واقعی عورتیں اپنی ہمراہیوں کے لئے حق بجانب ہیں"۔

الغرض جب ساری رسمیں پوری ہو چکیں۔ جانے والے چلے گئے، اور سوگوار زندگی

شکلیں آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں تو احمد ایک ستون سے لگ کر خاموش بے حس و حرکت کھڑا ہوگیا۔ گھر عشق و محبت کی نئی پرانی تصویر دل سے خالی تھا۔ عورت کے نام کی بوند تک نہیں رہی تھی۔ گو صنفِ نازک کے متعلق احمد کے دماغ میں اسوقت نہ کسی قسم کے خیالات میں نہ تفکرات۔ نفرت نہ رغبت۔ وہ صرف اپنے باپ کے تصور میں محو۔ وہ اس کی آخری باتوں کو اپنے دل میں دہرا رہا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ مرنے والا کسی خاص قوت کا مالک تھا۔ اس کی نصیحتیں اس کے جیتے جی میرے لئے قابل عمل ہوتیں یا نہ ہوتیں لیکن اب کوئی طاقت مجبور کر رہی ہے کہ اُن کے سامنے ہتھیار ڈال دوں۔ اس لئے احمد کی آنکھوں کے آگے سے ایکدم پردہ سا اٹھنا شروع ہوا۔ اس نے ایک جھرجھری لی۔ قدموں کو جنبش ہوئی۔ اپنے عالیشان مکان کے وسیع ایوانوں میں سے گذرتے ہوئے وہ آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ مرحوم باپ کی وصیت پر عمل کرنا چاہئے اور یہ کہ رسم و رواج کی طاقت اس کی اپنی مرضی اور ارادہ سے زیادہ قوی ہے۔

احمد آخر شریف زادہ تھا۔ دوسرے اس کی سلامتی چاہنے والا اور اس کا پردہ پوش اٹھ گیا۔ توبہ تو خیر وہ کیا کرتا۔ مقاصد کی کامیابیاں، دولت، جوانی، کسی نے جواب دیا ہوتا تو شاید وہ تائب بھی ہوجاتا۔ تاہم اسے ضرورت محسوس ہو چلی تھی کہ پرانے اشغال چھوڑ دینے چاہئیں اور اب گھر کی چار دیواری کے اندر خاموشی کے ساتھ اسباب راحت فراہم کئے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ دل میں ارادہ کیا کہ تنہائی کا غم غلط کرنے کے لئے نازک اندام، حسین، خوش گلو، رقاصہ اور مغنی لڑکیاں بہم پہنچائی جائیں۔ دن بھر کی کاروبار کی کلفتیں دور کرنے اور دل لگی کا خدا چاہے تو سامان ہو جائے گا۔

یہ ابھی اپنی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ نورالدین بھائی کے گھر کی رونق اپنے گھر میں چھوڑ کر بھتیجے کے پاس آیا۔ سوگ نشین کی دلداری اور اس کے ساتھ کھانا کھانا رسم میں داخل ہے۔ حاضری چُنی گئی۔ چچا بھتیجے دونوں مل کر بیٹھے۔ امیروں کی حاضری تھی۔

عزیزوں کی کڑوی روٹی نہیں۔ زمانہ کی تلخی و ترشی کو خوشگوار بنانے کے لیے کئی قسم کے کھانے اور طرح طرح کی مٹھائیاں موجود تھیں۔ دن گذرا۔ رات آئی موم بتیاں چھتوں میں لٹکی ہوئی خوشبودار روغنیات کی قندیلیں روشن ہوئیں۔ آدمی خالی ہاتھ آتا اور خالی ہاتھ جاتا ہے۔ ساتھ جاتے ہیں تو صرف اس کے اعمال۔ مرنے والے کے ساتھ کوئی مرتا نہیں۔ مرنا تو ایک طرف کسی کے طور طریق میں بھی فرق نہیں پڑتا ہاں چند روز اداسی سی ضرور چھا جاتی ہے۔ یہی انسان کی بھول اور یہی دنیا کے کارنامے ہیں۔ پھر دسترخوان بچھا۔ عزیز و احباب جمع تھے۔ ہاتھ دھو کر سب بیٹھ گئے۔ جب کھانے سے فراغت پائی جس خدا مستغنی و پاک ہے تو احمد نے متین صورت بنا کر چچا سے کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے اپنے باپ کے گھر کو آباد کرنا چاہئے تاکہ میں بھی ایک باپ بن جاؤں۔ میرے لڑکپن کا زمانہ گزر گیا" نورالدین نے اپنی لمبی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور جواب دیا "اللہ کی ذات قادر و توانا ہے۔ اس کی مشیت میں کسی کو دخل نہیں"

چمن میں کھلنے والی کھڑکیوں سے آنے والے ہوا کے جھونکے موم بتیوں کی لو کو لہرا رہے تھے اور خوردانوں میں سے خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ احمد بولا "چچا! آپ نہیں جانتے کہ میرے جذبات کتنے طوفانی ہیں۔ اب میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ والد بزرگوار کی موت نے بیک وقت در خواہش دونوں کو چھین لیا ہے۔ مجھ میں جرأت نہیں کہ کہیں اپنی دلبستگی کے سامان تلاش کروں۔ آپ واقف ہیں کہ میرے غلط اور غیر شریفانہ طرز عمل نے آپ کے مرحوم بھائی کو کس قدر اذیت اور رنج پہنچایا۔ میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد اس کی روح بھی بےچین رہے اور جنت میں بھی اسے میری طرف سے سکون نصیب نہ ہو۔ ایسا سکون جس کا ہر مسلمان متمنی ہے۔ میں شادی کروں گا۔ اہل ثروت کی شریعت اور سنت کی رسم کے خلاف صرف ایک عورت سے۔ ایک عورت کی نگہداشت دو۔ تین، چار کی پاسبانی سے زیادہ آسان ہے۔ میں اپنی بیوی کی حفاظت کے لئے خونخوار

جرہیبت لگ گئے بہت فراجہ نہ ملازم رکھوں گا۔ مکان کی چار دیواری کو اور اونچا کرنے اس کی کھڑکیوں میں لوہے کے مضبوط جنگلے لگانے کی میں نے ٹھان لی ہے۔"

نورالدین۔ پھر تم بے فکر ہو جاؤ گے؟

احمد۔ پورا یقین تو نہیں۔ شاید اس وقت بھی میں دھوکے سے نہ بچ سکوں۔

نورالدین۔ اللہ دونوں کو بدگمانیوں سے محفوظ رکھے!

احمد۔ آمین!

نورالدین۔ لیکن کیا خانۂ خدا میں حاضر ہونے کے بعد بھی تمہاری صرف اسیقدر تسلی ہوتی ہے۔؟

احمد۔ وہی بہتر جاننے والا ہے!

نورالدین۔ میرے بھتیجے شادی کرنا سنت ہے۔ تم کو ضرور اپنا گھر بسانا چاہئے۔ مگر یہ ظاہر و باطن میں یکساں کھوٹی کھری نہیں ہوتی۔ جب بیوی بناؤ ضرورت سے زیادہ اس کی دلداری اور قدر دانی کرنے میں عقل سے کام لینا۔ عورت کی عام فطرت ہے کہ جہاں اسے معلوم ہو گیا کہ وہ چاہنے کے قابل ہے اور ایک شخص سینکڑوں تمناؤں کی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے تو پھر اس کے فریب کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ مرد کی پر پور پر اسے داؤں سوجھتا ہے۔ اس میں میری بیوی ہو یا کوئی اور۔ میں تو اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر یہی کہوں گا کہ عورتوں پر بھروسہ کرنا کہ وہ کسی ایک کی ہو کر رہیں۔ غلط نادانی اور حماقت۔ ابھی تو یہ کہتا ہوں کہ تمام عمر انکی جانب سے اطمینان ہوا نہیں۔

احمد کے باپ محمود اور چچا نورالدین کے مزاجوں میں بڑا اختلاف تھا۔ مرحوم صلح پسند، نرم طبیعت اور حرم کی عورتوں سے محبت کرنے والا، نورالدین جھگڑالو، تندخو اور بدگمانی کا پتلا۔ اس لئے احمد پر چچا کی تقریر کا چنداں اثر نہیں ہوا۔ ان صفات کا

آدمی دہوکا نہ کھائے تو تعجب ہے۔ دوسرے اس کو علم تھا کہ ان حضرات کی اس ساری گفتگو کی تان کہاں ٹوٹتی ہے۔ بات یہ تھی کہ نورالدین نے دمشق کی ایک حسین ترین لونڈی خریدی تھی۔ ساٹھ برس کے پیر فرتوت اور تیرہ چودہ سال کی دوشیزہ کا کیا جوڑ۔ آخر وہ بھاگ گئی۔ شباب کی گرمی اور بڑھاپے کی سردی کہیں ایک جگہ جمع ہو سکتی ہے۔ تاہم انہیں عورت کو بے وفا کہنے کا موقع ہاتھ آگیا۔

محمود کو خوش قسمت میں گنے ہوئے دوسرا دن تھا کہ رات کو احمد نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک آراستہ کمرہ میں کوئی مست شباب لڑکی آنکھوں میں موہنی۔ چہرہ گلاب کا شاداب پھول۔ تبسم کی تصویر، حسن کا مجسمہ کھڑی ہے۔ حیران پریشان کہ میں کہاں آگیا؟ آج خیر نہیں۔ اب اس نے تالی بجائی حبشی تلواریں سونتے نکے دور تکا بوٹی ہو گئی۔ خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر جو کھولیں تو مکان اپنا ہی ہے۔ اپنی خوابگاہ۔ اپنا ساز و سامان اور وہ پیکر حسن و شباب بھی اپنی ہی حیثیت سے۔ خدا جانے کیا واسطہ؟ خوشی میں مست ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے کے لئے بڑھنے ہی والا تھا کہ پہلو کا دروازہ کھلا اور ایک شریف وضع کا حسین نوجوان لباس فاخرہ پہنے سر پر نیلے رنگ کی بانکی ٹوپی رکھے داخل ہوا۔ اور لڑکی کے پاس جا کر بے تکلف اس کی پٹی جس میں زمرد جڑے ہوئے تھے کھول ڈالی۔

احمد کے خواب کا سلسلہ بڑی دیر تک قائم رہا اور خدا جانے کیا کیا دیکھا۔ کہنے کو خواب کچھ دل خوش کن نہ تھا۔ اس کے گھر میں اجنبی مرد کا دخل، وہ بھی حسین اور نوجوان پھر اس نے دست درازیاں وغیرہ جو کچھ کیں اس کی اپنی بیوی کے ساتھ خواب میں سہی، ہوئیں تو بے عزتی کی باتیں۔ لیکن جب وہ بیدار ہوا ہے تو اس کے چہرہ پر گھبراہٹ تھی نہ آنکھوں میں رقابت کی جلن۔ البتہ دیکھنے والوں نے اسے کسی گہرے سوچ میں ضرور دیکھا۔ جذباتی آدمی اپنے خوابوں کو دماغ کا خیالی پلاؤ نہیں جانتے۔ ان سے طرح طرح کے نتیجے

احمد بھی اپنے اس خواب کی تعبیر نکالنا چاہتا تھا۔ قاہرہ سے اس فن کی کتابیں منگوائیں مشہور معبّروں سے ملا۔ کتابوں کی ورق گردانی اور ہر تعبیر دینے والے کی جدّ و کاوش نے جب زیادہ الجھن میں ڈالا تو احمد نے اپنے دل سے تعبیر لی کہ "پہلو کے دروازہ سے آنے والا نوجوان وہ خود ہی ہے۔ وقت کی دیر تھی پہلے پرائے گھروں میں عیش کی خاطر جاتا تھا۔ اب اپنا ہی گھر عشرت کدہ بن جائے گا" اور ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ اب اسے بے تامل محسرا کے فرش کو مشام تازہ کرنے والی خوشبوؤں سے معطر کرنا چاہیئے۔ اُن قدم میمنت لزوم کی پیشوائی کیلئے جو میری زندگی کو بہشت بنا دیں گے۔

"سہو و خطا سے بری تو صرف ایک وہی ذات ہے" احمد نے مصمم ارادہ کر لیا کہ باپ کی وصیت پر عمل کیا جائے۔ اسلامی قانون کے مطابق شادی کرنی چاہیئے۔ چرچے کی دیر تھی۔ چاروں طرف سے نامۂ پیام آنے لگے۔ امرازادیاں اور بڑے بڑے نامی وگرامی سوداگروں کی بیٹیاں بیش بہا جہیز، لونڈی غلاموں، املاک و باغات کے ساتھ زوجیت میں آنیکو تیار تھیں۔ یہی نہیں بلکہ بردہ فروشوں کا بھی تانتا لگ گیا۔ جو ہے اپنا مال دکھانے چلا آتا ہے۔ ہندی، چینی، ترکستانی، ایرانی، گرجستانی، جس ملک کی کہو، جس رنگ و روپ کی چاہو، شوخ، متین جیسی پسند ہو۔ اچھی طرح دیکھ بھال کر پسند کر لو۔ کسی قسم کا پردہ نہیں۔ لیکن احمد کچھ عجیب قسم کا آدمی تھا۔ اسے یہ حسین لڑکیاں باوجود اپنی شانِ دلبری کے بردہ فروشوں کے ساتھ قابل نفرت معلوم ہوتی تھیں۔ بردہ فروش اپنی اپنی لونڈیوں کے جس قدر خوبصورت نام لے لے کر احمد کو متوجہ کرنا چاہتے۔ اسی قدر وہ پیچھے ہٹتا جاتا۔ دنیا جانتی ہے کہ لونڈیوں کو شرم و حیا اور عفت و عصمت سے کیا واسطہ؟ ان غریبوں سے یہ چاروں چیزیں چھین لی جاتی ہیں۔ عورت برہنہ ہو گئی تو باقی کیا رہا؟ اور احمد اس وقت عورت میں یہی چاروں جوہر چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اسے شادی کرنی تھی نہ کہ عیاشی۔

ایک ایسے ہوشیار شخص کو جس کی عمر گزری ہو اسی دشت کی سیاحی میں: لونڈیاں

سکے تاجروں کی زبان کا جادو یقین دلا سکتا تھا کہ ان کا مال ڈس کا نوٹا ہے۔ عام طور پر ایسی لڑکیاں جو زمانہ کے شر سے محفوظ ہوں، اچھے اچھے گھرانوں میں تو دکھائی دیتی نہیں۔ لونڈیاں جن کو جبراً شرم و حیا کی جبلی عادت ترک کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے وہ کہاں سے آگئیں۔ اس طرح اس نے بڑی دلیری سے ان تمام پیغامات کو بھی ٹھکرا دیا جن میں والدین نے اپنی بیٹیوں کی تعریف کے پل باندھ رکھے تھے۔ ایک مسلمان کو مبالغہ سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ جبکہ کسی چیز کا پورا علم بھی نہ ہو۔ "خبیر و علیم" "سمیع و بصیر" صرف وہی ہے۔ ماں باپ بھلا اپنی اولاد کا حال کیا جانیں۔؟

باپ کی وفات سے زندہ دل سرد طبیعت پژمردہ اور ولولے پست ہو گئے تھے اس کی زندگی بڑی بے آرامی میں گزر رہی تھی۔ ذرا تو وہ اپنے پرانے شوق کو ایک حد تک بھول چکا تھا۔ دوسرے بغداد بھر میں کوئی ایسی اچھوتی جگہ اسے دکھائی بھی نہیں دیتی تھی جہاں وہ اپنی خواہش پوری کرے۔ مثل ہے کہ خانہ خالی را دیو می گیرد۔ ذوق حسن پرستی نے پھر اسے ستایا۔ راتیں کاٹنی دوبھر ہو گئیں۔ خیال کیا کہ چوری اچھی نہیں، ہیرا پھیری میں کیا برائی ہے۔ چنانچہ وہ لوگوں کی آنکھ بچا کر کبھی کبھی اپنی ہیر پھیر پوری کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تاہم اس مرتبہ اس کا ارادہ کسی کی ناموس کو خراب کرنے کا نہیں تھا بلکہ صرف نظارہ خوش گزرے۔ اسے محلسراؤں کی حسین اور جوان لڑکیوں کو اٹکھیلیاں کرتے دیکھنے کی خواہش تھی۔ یہ اس لئے کہ شاید وہ اپنے لئے کوئی رفیق زندگی انتخاب کر سکے۔ ممکن ہے کہ یونہی چلتے پھرتے بیوی کا ارمان خاطر خواہ پورا ہو جائے۔

دریائے دجلہ کے کنارے ایک مالدار سوداگر رہتا تھا۔ عالیشان مکان، مکان کے چوگرد نہایت خوشنما باغ۔ باغ کی دیوار کے نیچے پانی۔ ایک یہی بڑی حویلی احمد کے حملہ سے بچی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ ادھر کا اس نے کبھی رخ بھی نہیں کیا۔ اب یکایک اسے خیال آیا۔ دیوانے کے لئے ہو کافی ہے۔ فوراً کھڑا ہو گیا۔ گرمیوں کی خوشگوار رات

تھی۔ کمند اپنے کندھے پر ڈال دریا کے کنارے پہنچا۔ یہ دریا اور منزل مقصود پار۔ کپڑے اتار غوطہ لگا۔ باغ کی دیوار کے قریب جا نکلا۔ کمند ڈال دیوار پر چڑھا اور باغ میں کود پڑا۔ چند لمحے دم لیکر پتلون پہنے آدمی بنا پھر ادھر ادھر تاکنے لگا اور آنکھیں دوڑانی شروع کیں۔ سامنے ایک فوارہ نظر آیا۔ چاندنی میں اس کی پھوار بادلہ اڑا رہی تھی۔ فوارے کے گرد اگرد ایک وسیع حوض تھا جس پر کھجور اور دوسرے طویل القامت درخت چھائے ہوئے تھے۔ حوض کے قریب سے ایک بجری کی پتلی سی سڑک سیدھی مکان تک چلی گئی تھی۔ اسی طرح مکان کے چاروں سمتوں میں حوض اور فوارے تھے۔ اندر کے دیدار سے کوئی آدمی کا اس مکان میں ہونا ثابت نہیں ہوتا تھا۔ البتہ درختوں پر بسیرا لینے والے کچھ پرندے اڑے کچھ پھڑپھڑائے اور رینگنے والے جانوروں نے خشک پتوں میں کسی قدر کھڑکھڑاہٹ پیدا کی۔ اتنے میں سامنے دور کچھ روشنیاں سی دکھائی دیں جو اسی طرف آرہی تھیں جہاں اندھیرا تھا۔ یہ پیچھے ہٹا کہ جب تک چھپنے کی ضرورت ہے چھپ [illegible]

جس سوداگر کا یہ باغ اور مکان تھا اس کے تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکے عموماً تجارت کے سلسلہ میں باہر رہتے۔ لے دے کے گھر میں دکھائی دیتی تو یہی لڑکی۔ باپ کی تمام محبتیں اسی کے اندر جمع تھیں۔ ہر وقت اس کی دلجوئی کا خیال رکھتا۔ اس کی آنکھ میلی ہوتی تو حسیب بے چین ہو جاتا۔ لونڈیاں باندیاں دن رات اس کا دل بہلایا کرتیں گھر میں رہتی تو شہزادیوں کی طرح۔ باہر نکلتی تو خوجہ سرا ننگی تلواریں لئے اس کی سواری کے ساتھ ساتھ ہوتے۔ باپ کے ارمانوں میں ایک بڑا ارمان اپنی اولاد کا سہرا دیکھنا بھی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔ لڑکی کی عمر بارہ سال کی ہوگئی تھی۔ گرم ملکوں میں یہ عمر شادی کے قابل سمجھی جاتی ہے مگر حسیب اس کی جدائی کے خیال سے شادی کا تصور بھی دل میں نہ لاتا۔ جب کاروبار سے جی گھبراتا۔ بیٹی کے پاس آبیٹھتا، اس کی باتیں سنتا اور سمجھتا کہ جیسے جی جنت میں ہوں [illegible]

اس کا نام انیس جلیس رکھا تھا۔

جس رات، احمد، بزرگ حسیب کے مکان میں داخل ہوا ہے گرمی کی ایک رت تھی۔ بہت سہانی۔ چاندنی پھیلی ہوئی۔ وہاں کا دستور تھا کہ ایسے دنوں میں عورتیں صبح سے شام تک گھروں کے اندر بیٹھی رہتیں اور جب سورج غروب ہو جاتا تو ہوا کھانے باغوں میں جاتیں اور دل بہلاتیں۔ انیس جلیس بھی اپنے اوقات اسی طرح گزارتی۔ چنانچہ احمد نے جو مکان سے نکلتے ہوئے پرچھائیاں سی دیکھی تھیں وہ یہی انیس جلیس اپنی خادماؤں کے جھرمٹ میں تھی۔

انیس جلیس حسب معمول خراماں خراماں باغ میں آئی۔ حوض کے قریب ایک جگہ ٹھٹکی اور ایک خاص انداز کے ساتھ مختصر سا رقص کیا۔ نازک سریلی آواز سے گانے لگی۔ ایک حبشن تنبورہ ہاتھ میں لئے ہوئی تھی۔ عجب سماں بندھا۔ موسیقی کے شوقین احمد کی روح وجد میں آگئی۔ وہ لڑکی اپنی کنیزوں کے ساتھ چہلیں کرتی، ناچتی گاتی سیدھی وہاں آکر کھڑی ہو گئی جہاں احمد چھپا ہوا تھا۔ وہ زرد رنگ کا لمبا کرتا پہنے ہوئے تھی جس پر لیس کا شیشہ ٹکا ہوا تھا۔ کرتے کے اوپر ساٹن کی ایک دوسری پوشش تھی۔ اس کے دامنوں پر سنہری پھول بنائے گئے تھے۔ انیس جلیس کی شان کا کیا کہنا۔ اس کے پہناوے میں ایک نئی بات یہ دیکھی گئی کہ اس کی کمر سے ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ایسی جیسے چاند کے گرد ہالہ۔ نیگوں رنگ پٹی میں جڑے ہوئے بیش قیمت موتی اور جواہرات کی جگمگاہٹ سے یہ معلوم ہوتا کہ آسمان پر تارے چمک رہے ہیں۔

گرمی، چاندنی رات۔ فوارے کی آبی شوخیاں۔ طبیعتیں قابو میں نہ رہیں۔ نہانے کو دل چاہا۔ پہلے تو حوض میں پاؤں لٹکائے۔ پانی کی لہروں کو ٹھکرایا۔ پھر جو موج آئی تو کپڑے اتار نہانا، چھینٹے اڑانا شروع کر دیا اور ایسی نہانے میں لگیں کہ ہر طرف سے بیخبر ہو گئیں احمد کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ بھی ان میں آ ملے۔ دیکھتے دیکھتے آخر اس کی نیت بگڑی

اور کچھ نہیں تو اسے ایک نیا مذاق سوجھا۔ چپکے چپکے پیٹ کے بل کھسکتے کھسکتے اس جگہ آیا جہاں ان کے کپڑے رکھے تھے۔ آہستہ سے ہاتھ بڑھا انیس جلیس کی پٹی اٹھائی اور الٹے قدموں مہندی کی ٹٹیوں کے پیچھے آبیٹھا۔ لڑکیاں اپنے کھیل کود میں مدہوش، خوش فعلیوں میں مصروف۔ انہیں خبر تک نہ ہوئی کہ کیا ہوگیا۔ وہ اپنی دھن میں غوطے پر غوطے لگا رہی تھیں اور چھیڑ چھاڑ بھی ہوتی جاتی تھی۔ انیس کی خاص لونڈی ہاجرہ نے حبشن سے کہا "اری کیا کسی طرح یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ کسکی شادی کہاں ہوگی؟" حبشن تیز لہجہ میں بولی "گھبراتی کیوں ہے میری قمری! کوئی دن کی بات ہے۔ دوسرے سے پوچھنے کی کیا ضرورت خود معلوم ہو جائیگا"۔ انیس کہنے لگی۔ میں نے سُنا ہے کہ یہاں کوئی رمل ہے جو ریت پر لکیریں کھینچ کر کچھ حساب لگاتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ کس کا عاشق کہاں ہے؟ کب آئے گا؟ اور جو پوچھو! گویا وہ اس قسم کے سارے بھید جانتا ہے"۔

ہاجرہ۔ غیب کا علم تو بس اللہ ہی کو ہے، دوسرا کیا جانے کہ کیا ہوگا؟

انیس۔ اری جل ککڑیوں (ہنستے ہوئے) جلی کیوں مرتی ہو۔ کوئی بن بیاہی نہیں رہے گی۔ اپنے وقت پر سب کے خصم پیدا ہو جائیں گے۔ مجھے تو فقط ایک فکر ہے۔؟

حبشن۔ بی بی تیرے دشمنوں کو کیا فکر؟

ہاجرہ۔ میں بھی سنوں!

انیس۔ کوئی بتانے والا ملے تو اتنا بھی پوچھوں کہ میرا میاں مجھے مارے گا تو نہیں۔ سنا ہے کہ مرد مرکھنے ہوتے ہیں۔ آج تک تو نہ مجھے بھائی جان نے ہاتھ لگایا نہ ابا جان نے لگم گُر کا۔

یہاں یہ باتیں کرتے کرتے ابھی لڑکیوں کا حوض سے نکلنے کا ارادہ ہی ہو رہا تھا کہ احمد اپنی گھات کی جگہ سے اُٹھا۔ پٹی اپنی کمر سے لگائی اور دبے پاؤں باغ سے نکل دیوار پر چڑھ دریا میں کود گیا۔ پانی میں آواز ہوئی، اتنی زور سے کہ ہاجرہ نے چونک کر کہا "کچھ

سُنا: کوئی بھاری چیز ابھی دریا میں گری ہے، مگر وہ باہر نکلنے کی جلدی میں تھیں۔ کسی نے توجہ نہ کی۔ رات زیادہ آگئی تھی انیس اور اس کے ساتھ والیوں نے جلدی جلدی بدن پونچھ۔ کپڑے پہننے شروع کئے۔ دیکھا تو پیٹی نہیں۔ کون لے گیا، کہاں گئی؟ ادھر دیکھ اُدھر دیکھ! لکھڑی ایک دوسرے کا مُنہ دیکھ رہی تھیں۔ یہ آسمانی رنگ کی پیٹی حال ہی میں انیس کے باپ حسیب نے احمد کی دکان سے خریدی تھی۔ اس کی قیمت ایک ہزار دینار ابھی ادا بھی نہیں کئے تھے۔ پیٹی ہندوستانی دستکاری کا بے مثل نمونہ تھا۔ احمد نے یہ یقین دلا کر دی تھی کہ اس کا ثانی سارے بغداد میں تو نکل نہیں سکتا۔

بے مثل اور بیش قیمت نہ بھی ہوتی تو بھی اپنا مال، اس طرح تیپٹ ہوتے کب دیکھا جاتا۔ پھر یہ پیٹی تو انیس کے شوق کی چیز باپ کی محبت کا تحفہ تھا۔ سب حیران سب پریشان۔ گھور گھور کر چاروں طرف دیکھا۔ ہاتھوں سے زمین ٹٹولی۔ میدان صاف۔ حوض میں جھانکا۔ پانی صاف، چاندنی میں تہ میں بیٹھی ہوئی مچھلیاں تک نظر آتی تھیں۔ پیٹی ہوتی تو کیا نظر نہ آتی۔ انیس اپنی جگہ اداس کنیزیں اپنی جگہ لرزاں و ترساں سے

شبنم کے سوا چرانے والا ادپر کا تھا کون آنے والا

باغ میں رنگ رلیوں کا ایک وقت ہوتا ہے۔ جب بہت دیر ہوگئی تو محل کا خواجہ سرا ان کی تلاش میں آیا۔ خواجہ سرا سے پیٹی کے گم ہو جانے کا ذکر کرتیں تو ابھی ادھم مچ جاتی۔ اس لئے چپ چپاتے اس کے ساتھ ہولیں۔ مگر انیس اور ہاجرہ کو فکر کے مارے رات بھر نیند نہ آئی۔ کروٹیں لیتے ہی لیتے صبح ہوگئی۔

یہاں تو یہ گزر رہی تھی اب احمد کی سُنو۔ اس نے دریا سے نکل سیدھا گھر کا راستہ لیا۔ تھکا ہارا تھا۔ پیٹی کمر سے باندھے اپنے گدگدے بستر پر لیٹ گیا۔ نیند کیسی؟ غنودگی آئی ہو تو "آئی ہو" آنکھ لگ جاتی ہے جس کی اس کو کب آتی ہے نیند! باغ میں جو جلوے نظر آئے تھے وہ کیا سونے دیتے؟ یونہی کروٹیں بدلتے بدلتے اذانیں ہونے

تھیں۔ اٹھ بیٹھا۔ بیٹی کو کمرے سے کھولا۔ وضو کیا۔ کچھ خود درود ہوا۔ نماز پڑھی۔ دل کی وحشت دور ہوئی۔ لیکن جاگتے میں جو خواب دیکھا تھا اس کی کیفیت آنکھوں میں تھی۔ بیٹی ہاتھ میں لی۔ اسے چوما۔ آنکھوں سے لگایا۔ بار بار ٹھنڈے سانس لیتا۔ انیس جلیس کو یاد کرتا۔ اسکی یاد سے دل میں ایک قسم کی لذت محسوس کرتا۔ انیس جلیس کی تصویر اس کے تصور میں پھر رہی تھی۔ کبھی وہ بیچ پر ہاتھ رکھ کر بیٹی سے خطاب کرتا: "تو بڑی خوش نصیب ہے۔ تجھے ایسے نازک اندام نے اپنی مرمری آغوش میں لینے کی عزت دی۔ جس کا چہرہ چودھویں رات کا چاند اور بال مشک و عنبر کی طرح سیاہ اور خوشبودار ہیں"۔ کبھی آنکھیں بند کرکے کہتا "اللہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔ وہ بڑا رحیم ہے۔ اس کی مرضی ہو تو یہی بیٹی میری خانہ آبادی کا پیش خیمہ ہو جائے"۔ اسی قسم کی باتیں وہ بڑی دیر تک اپنے دل سے کرتا رہا یہاں تک کہ دن خاصہ چڑھ آیا۔ ساری دکانیں کھل گئیں۔ کاروبار شروع ہو گئے۔ جی تو اس کا نہیں چاہتا تھا مگر اٹھا اور اپنی دکان کی طرف چلا۔

دکان پر پہنچا تھا کہ بردہ فروشوں اور شہر کی مشاطاؤں نے جو اس کا انتظار کر رہی تھیں اسے گھیر لیا۔ احمد پہلے ہی ان سے بیزار تھا اور اب تو آنکھوں میں سرسوں پھول چکی تھی۔ اس نے ان بلاؤں سے پیچھا چھڑانے کے لئے صاف کہہ دیا کہ مجھے آپ لوگوں میں سے کسی کو تکلیف نہیں دینی۔ آپ مجھ کو معاف کریں۔ میں نے اپنا انتخاب کر لیا ہے سوداگر تو اس جواب کے بعد کیا ٹھہرتے البتہ بعض ثقہ بیاہی کچھ اٹکے۔ انہوں نے کوشش کی کہ احمد کو ٹٹولیں۔ لیکن اس نے اپنے انتخاب کی کسی کو ہوا تک نہ لگنے دی۔ ہاں اب اس پر ایک دوسری دھن سوار ہو گئی۔ یعنی مطلوبہ کے استقبال کی تیاری کرنے لگا محل سرائے کو نئے سامان سے آراستہ کیا۔ کمروں کو خوب سجایا۔ آنے والی بیگم کی خدمت اور دلبستگی کے لئے ہر قسم کی کنیزیں خریدیں جن میں فن موسیقی سے واقف بھی تھیں۔ ایسی پڑھی لکھی بھی کہ قرآن شریف کی تفسیر۔ فقہ کی تشریح، حدیث کی تنقید کر سکیں۔ تاکہ

انیس کو تب ہی کسی طرح کا شوق پیدا کرنے میں بڑی دقت نہ ہو اور وہ ہنسی خوشی عیش و آرام میں گزارے۔

وہ بے اشتیاق تھی۔ اُدھر انیس و ہاجرہ کو پیٹی کا غم تھا۔ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ جب موقع ملتا باغ میں جاتیں۔ ڈالی ڈالی دیکھ ڈالی۔ چپہ چپہ چھان مارا۔ کئی دفعہ حوض کا پانی نکالا اور پھر بھرا۔ پیٹی ہوتی تو ملتی۔ ایک ہفتہ اسی طرح گذر گیا اور پیٹی کے ملنے سے بالکل مایوسی ہوگئی تو صلاح ہوئی کہ جہاں سے یہ پیٹی خریدی گئی تھی دوسری اسی رنگ اسی وضع کی خریدی جائے۔ چنانچہ ایک دن احمد اپنی دکان کے دروازہ میں کھڑا تھا، اس نے دیکھا ہاجرہ آرہی ہے۔ وہ اُٹھ کر دکان میں آگیا۔ ہاجرہ بھی اندر آئی اور خاموش کھڑی ہوگئی۔ احمد سمجھ گیا کہ تخلیہ چاہتی ہے۔ اس نے دکان کے آدمیوں کو کسی ترکیب سے اِدھر اُدھر کر دیا اور پوچھا "کہیے کیا حکم ہے؟"

ہاجرہ۔ جی ہاں۔ ایک تحفہ دینا ہے۔ ہم اپنی مالکہ کی ایک رشتہ دار کو دیں گے۔ کیا آپ کے پاس آسمانی رنگ کی کوئی ایسی پیٹی ہے جس پر قیمتی جواہرات ٹکے ہوئے ہوں۔ بالکل ویسی ہو جیسی کچھ عرصہ ہوا انیس بیگم کے دلہا حسیب نے آپ سے خریدی تھی۔

احمد۔ (انجان بن کر) میں کچھ سمجھا نہیں۔ پرانی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں۔ آپ وہ پیٹی لائی تو ضرور ہوں گی۔ ذرا دکھائیے بغیر دیکھے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

ہاجرہ۔ (تیوری چڑھا کر) خوب! محمود کے بیٹے احمد خوب!! اتنی جلدی بھول گئے۔ جوہری ہو کر ایسی باتیں۔ کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس پیٹی کا جواب نہیں۔ ہندوستان کی بہترین صنعت ہے۔ اور اس کی جوڑ ملنی محال ہے۔ اس کی قیمت تم نے ایک ہزار دینار لی تھی۔ اب بھی سمجھے۔ اتنی تفصیل سن کر بھی کیا انجان بنے جاؤ گے۔

احمد۔ اللہ تم پر رحم کرے! میں تمہیں آزمانا چاہتا تھا۔ بھلا ایسی پیٹی تم کیونکر حاصل کر سکتی ہو جو کہیں نہ مل سکے اور جس کا بنانے والا دنیا میں نہیں رہا۔ پھر بفرض محال میری کوشش اور تمہاری مالکہ کی تقدیر سے کہیں مل بھی گئی تو تم اس کی قیمت ادا کر سکو گی؟

جوہری ایسی نایاب چیز کا مول منہ مانگا نہیں کرتے ہیں۔ اور کیا تم اس قدر گراں بہا تحفہ دے سکتی ہو؟ شیخی باز۔ جھوٹوں کی خالہ۔ اکیا تمہارا خیال ہے کہ احمد تمہارے بنائے احمق بن جائیگا؟

ہاجرہ عورت ذات احمد کے دڑبڑانے میں آگئی اور انیس جلیس کی مایوسی کا خیال کرکے اس کے چہرہ پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ خوشامدانہ احمد کے کندھے پر رکھا اور بولی "جناب اگر آپ اخفائے راز کا وعدہ کریں تو میں کچھ عرض کروں۔ معاملہ ذرا نازک ہے"! احمد دل میں مسکرایا مگر بظاہر روکھے منہ سے جواب دیا "کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟ جوہری ہمیشہ رازدار ہی ہوتے ہیں"۔

ہاجرہ نے ڈرتے ڈرتے چیڑے کے اچانک کھو جانے اور انیس کی پریشانی و پژمردگی کا سارا قصہ کہہ سنایا اور ایک عجیب انداز سے احمد کی طرف دیکھنے لگی گویا اس نے زبانِ حال سے التجا کی کہ اگر تم مہربانی فرماؤ تو ہم غم و فکر سے نجات پا سکتے ہیں۔ احمد نے مزے لے لے کر ہاجرہ کی داستان سنی، دکھانے کے لئے افسوسناک صورت بن کر ہمدردی کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ ضرور اسی قسم کی دوسری چیڑی بہم پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ ساتھ ہی ایک نہایت خوبصورت اور بیش قیمت انگوٹھی ہاجرہ کے سامنے رکھی اور کہا "یہ ناچیز تحفہ میری طرف سے اپنی بیگم کی خدمت میں پیش کرنا اور عرض کرنا کہ خدا چاہے تو چیڑی بھی تلاش کر دی جائے گی"۔ جب وہ چلنے لگی تو دوسرے روز پھر آنے کا وعدہ لیا۔

دوسرے دن ہاجرہ آئی تو رسمی باتوں کے بعد احمد نے رنگ برنگ کے جواہرات کی ایک خوشنما جڑاؤ تیتری دی جس کے بکس پہ خط کوفی میں "پرواز محبت" لکھا ہوا تھا۔ تیسرے دن ایک سونے کا سانپ بھیجا جسے کوڈیلہ بنانے کے لئے ہیرے جڑے گئے تھے اور جس کا پھن ایک بیش قیمت پتھر کا تراشا ہوا تھا۔ تحفوں کا یہ سلسلہ ایک ہفتہ تک برابر جاری رہا۔ ہاجرہ بلاناغہ روز آتی اور کوئی نہ کوئی چیز لے جاتی۔ ایک ایک تحفہ نادرۂ روزگار اور ہزاروں روپے کی قیمت کا تھا۔ مثلاً چوتھے روز احمد نے جو خنجر بھیجا وہ مصر کی کسی ملکہ کی یادگار تھا اور اس کے

قبضہ پر عجیب و غریب قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے پانچویں دن کا تحفہ دمشق کے ایک خاص کپڑے کی قمیض تھی۔ اس کے دامنوں میں بڑے بڑے موتی ٹنکے ہوئے تھے۔ متن پر سونے کے تاروں سے پرندوں کی تصویریں کاڑھی گئی تھیں۔ جن میں سے ہر ایک کی چونچ میں ایک ایک لعل یا زمرد کا طوطے کے پر جیسا سبز دانہ تھا۔ چھٹی مرتبہ ایک نفیس ترین بربط پیش کیا جو چین کی صناعی اور جس کی قیمت کم از کم پانچ ہزار دینار تھے۔

محبت کا ساز اکثر اسی طرح تیار کیا جاتا ہے۔ انیس ایک ایک چیز کو دیکھتی اور حیران ہوتی کہ عجب ملک لٹ جوہری ہے دوکان دار تو ایسے حاتم ہوتے نہیں۔ باوجود ان نت نئے تحفوں کے وہ ابھی اپنی پیٹی کو نہیں بھولی تھی۔ باپ کے سامنے جانے کو اس کا منہ نہیں پڑتا تھا اور اگر وہ پوچھ بیٹھتا تو کیا جواب دیتی۔ اس لئے وہ کبھی تو یہ سمجھتی کہ ممکن ہے پیٹی کا غم غلط کرنے کو بھیجی ہوں، پیٹی مہیا ہو جائے گی تو یہ پھر دوکان کا مال ہیں، کبھی خیال کرتی کہ آخر پکا بیوپاری ہے ایک دفعہ ہی سارے مال کی قیمت وصول کرے گا۔ اور کبھی کبھی اور شبہ بھی ہوتا لیکن یقینی طور پر کچھ سمجھ میں نہیں [illegible] کہتے ہیں ؎

خواہی کہ دلِ دلبرِ ما نرم شود [illegible]
زاری مکن و زور مکن زر بفرست [illegible]

ان تحفوں کے تانتے نے اور کچھ نہ سہی انیس کے دل میں ایک چینک سی تو لگا دی اسے اپنی طرف سے تو کسی قسم کا پیام سلام بھیجنے کی جرأت تھی نہیں مگر احمد کی سوغاتوں کا ہر وقت خیال رہتا۔ رات کو بیوی لونڈی جب مل کر بیٹھتیں تو احمد ہی کا ذکر ہوتا اور منتظر رہتیں کہ صبح کو کیا چیز آتی ہے۔ گویا دل سے دل تک اندر ہی اندر سرنگ لگ رہی تھی۔

اسی اثنا میں ایک شام کو جو ہاجرہ احمد کے پاس آئی تو اس نے فخریہ کہا کہ

"بڑی دشواری سے میں نے تمہاری بیگم کی فرمائش پوری کرنے کا بندوبست کیا ہے، ایک ہفتہ کے بعد تم کو بالکل ویسی ہی پیٹی مل جائے گی"

ہاجرہ۔ (خوش ہو کر) خدا تمہارے کاروبار میں برکت دے۔ اسی نمونہ کی؟

احمد۔ ہاں۔ ایک کو چھپا دو ایک کو نکالو۔

ہاجرہ۔ میں اپنی مالکہ سے کہہ دوں؟

احمد۔ بے تامل!

ہاجرہ یہ سن کر بغیر رخصت ہوئے بے تحاشا بھاگی اور انیس کو احمد کا پیام سنایا۔ وہ یہ خوشخبری سن انیس بڑی اور جوش مسرت سے تالیاں بجانے اور ناچنے لگی۔ احمد کی مروت اور فیاضی کے جو اس کے دل پر نقش ہو رہے تھے ابھرے۔ اس نے اپنے جذبات کو ہزار روکنا چاہا لیکن طبیعت کب مانتی تھی۔ آخر بے اختیار ہو کر وہ ہاجرہ سے لپٹ گئی اور کہنے لگی: "سچ، جوہری نے وعدہ کیا ہے؟"

ہاجرہ۔ اور کیا میں جھوٹ کہتی ہوں؟

انیس۔ وہ بہت بڑا جوہری ہے۔

ہاجرہ۔ سارے بغداد میں یکتا۔

انیس۔ اچھا، یہ تو بتاؤ کہ وہ ہے کیسا؟

ہاجرہ۔ (مسکرا کر) تمہارے جیسا!

انیس۔ چل بدذات! وہی مثل ہو گئی کہ منہ لگائی ڈومنی گائے تال بے تال۔

ہاجرہ۔ دیکھو گی تو معلوم ہو گا۔ پورا نوجوان، سجیلا، نکیلا، حسن کا پتلا۔ سانچے میں ڈھلا ہوا بدن۔ رنگ میدہ و شہاب۔ بیوی خدا نے اس کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ انیس کا دل تو یہ چاہتا تھا کہ ہاجرہ اس کی تعریف، اس کا ذکر کئے جائے اور وہ چپ سنا کرے مگر کنواری لڑکی محبت کا اقرار کس طرح کرتی۔ بظاہر اس نے تیور بدلے ہاجرہ کو ترچھی نظر

سے گھورا اور بولی، اپنی شرارت سے باز نہیں آئے گی، خدا کی پناہ، اتر نے تو چھوٹی لپاڈی لُٹیوں کو بھی مات کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر بیوی اس کی خوبصورتی بدصورتی سے کیا واسطہ؟ ہاں تو ساتویں دن ہماری بیٹی آجائے گی۔ پھر ہم باوا جان سے اجازت لیکر بازار جائینگے اور راستہ میں اگر احمد کی دکان پڑی تو اس کا شکریہ بھی ادا کرتے آئیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ حسیب کی بیٹی احسان فراموش اور خود غرض نہیں ہے۔

ہاجرہ، انیس اور احمد دونوں کی رازدار، دونوں کی ایلچی اور دونوں کی خیرخواہ تھی۔ اس کے علاوہ جوہری بچے نے اپنی خوش خلقی اور کچھ لے دیکر بھی اپنا بنا لیا تھا۔ اس نے سویرے اٹھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ احمد کے پاس پہنچی اور انیس کے خیالات و تاثرات کی پوری کہانی جا سنائی۔ آخر لونڈی تھی نا جیسا ظرف ویسی سمائی۔ ایسی ہی ہلکے پیٹ والیاں تو خاندانوں میں بجوگ ڈال دیتی ہیں۔ لیکن اپنے اپنے زمانے کے دستور کی بات ہے اُن دنوں میں لونڈیاں ہی سب کچھ ہوتی تھیں اور اچھے برے سارے کام انہی کے ہاتھوں انجام پاتے۔ انیس بے ماں کی لڑکی کوئی بہن نہیں۔ بھائی تھے وہ پردیسی۔ لے دے کے صرف ایک باپ تھا۔ وہ کیسا ہی چاہنے والا سہی بیٹی کا رازدار تو نہیں ہو سکتا۔ وہ لونڈیوں سے اپنے دل کی بھڑاس نہ نکالتی تو کیا کرتی۔ ہاجرہ اس کے بچپن کی سہیلی تھی۔ اس سے اس کا دل کھلا ہوا تھا۔ جوہری کی دوکان سے آکر ہاجرہ انیس کے کمرہ میں آئی ہنسی دل لگی کی باتیں ہونے لگیں۔ باتوں باتوں میں شادی کا ذکر چھیڑا۔

ہاجرہ۔ بی بی! نجانے آپ کے ابا جان نے کیا سوچا ہے۔ کھیلنے کھانے کے اصلی دن تو یہی ہیں۔

انیس۔ مجھ سے کیا پوچھتی ہے، ان ہی سے پوچھ!

ہاجرہ۔ کیا پوچھوں؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اگر موت کا قدم درمیان نہ ہو تو ابد، ایک لڑکی کا دلہن بننا دنیا کی ضروری رسموں میں داخل ہے۔

انیس۔ انہیں کوئی حسب دلخواہ رشتہ نہ ملتا ہوگا؟ یا کوئی اور بات ہوگی۔

ہاجرہ۔ اور کوئی کیا بات ہو سکتی ہے؟

انیس۔ تو نے میری جان کیوں کھائی۔ اُس جوہری کے ہاں کیا جانے لگی کہ اترا ہی گئی۔

ہاجرہ۔ اترانے کی تو یہ بات ہے کہ تمہارا دل جانتا ہے۔ ہاں مجھ سے کوئی پوچھے تو احمد جوہری سے زیادہ لائق داماد اور پھر تمہاری جوڑی کا سارے بغداد میں تو مل سکتا نہیں۔

انیس۔ تیرے ہی سے تو کوئی صلاح لے گا۔ بڑی جہاں دیدہ ہے نا۔ اچھا اپنی چونچ بند کرو۔ مجھے ایسے چونچلے نہیں بھاتے۔

ہاجرہ۔ من میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔

انیس۔ ہاجرہ۔ میں مار بیٹھوں گی۔ تجھے شرم نہیں آتی۔

دونوں ہنستی ہوئی چپ ہو گئیں۔ خواجہ سرا کھانے پر بلانے آ گیا تھا۔

خدا خدا کر کے چھ دن ختم ہوئے ساتواں روز آیا۔ انیس ایک ایک گھنٹہ گن رہی تھی۔ صبح ہی ہاجرہ کو پیٹی کے لئے بھیجا۔ وہ جوہری کی دکان پر گئی۔ احمد نے اسے ایک کھجوروں کا بڑا ٹوکرا دکھایا جو سرخ اون کا بنا ہوا تھا۔ اور اس ٹوکرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس میں مطلوبہ پیٹی ہے"!

ہاجرہ۔ تیار ہو گئی؟

احمد۔ تیار ہو گئی۔ میں نے اسی کو ڈھونڈ نکالا تمہیں اس سے کیا بحث؟

ہاجرہ۔ کہاں ملی؟

احمد۔ تمہیں آم کھانے ہیں یا پیڑ گننے۔ ہاں تو میں مغرب اور عشا کی نماز کے درمیان اس ٹوکرے کو چار غلاموں کے کندھوں پر رکھوا کر تمہاری مالکہ کی خوابگاہ میں

بھجوا دوں گا۔ آج تک جتنے تحفے میں پیش کر چکا ہوں، وہ ان کی شایانِ شان نہ تھے۔ خدا کرے یہ تحفہ انہیں پسند آئے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انیس اس ٹوکرے کو بالکل تخلیہ میں کھولیں۔

ہاجرہ۔ ورنہ؟

احمد۔ ورنہ بدنامی اور افشارِ راز کا ڈر ہے۔

ہاجرہ۔ عجیب! خدا تم کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھے!

کنیز نے جوہری کا یہ پیام اپنی مالکہ کو پہنچا دیا۔ اور ابھی زیادہ رات نہیں آئی تھی کہ ٹوکرا خواب گاہ میں آگیا۔ انیس کا دل دھکڑ پکڑ ہو رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف سے کواڑ بند کر کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے کھولا۔ ہائیں! یہ کیا؟ احمد نے کہانیوں کو پست کر دیا۔ جن کی طرح ٹوکرے میں سے نکل کھڑا ہوا بنا سنورا، زرق برق لباس اور ہاتھ میں وہی گم شدہ پیٹی۔ جسے ادب کے ساتھ جھک کر اس نے انیس جلیس کے سامنے پیش کیا۔

تنہائی، دروازے کھڑکیاں بند، کمرا اپنا، اور ایک غیر جوان مرد روبرو۔ لڑکی بھی چونک پڑی۔ سٹپٹا گئی۔ لیکن محبت کے اندرونی جذبات نے مدد کی۔ انیس نے پہچان لیا کہ ہو نہ ہو شریر جوہری ہے۔ وہ بالکل نہ چیخی بلکہ سنبھل کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ تاہم نسوانی حیا سے دو چار قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئی اور حفظِ ناموس کے خیال سے بے اختیار اس کا ہاتھ اس بیش قیمت دمشقی خنجر کے دستہ پر جا پڑا جو احمد نے تحفہ میں بھیجا تھا۔ احمد بھی خاموش سر جھکائے، گھٹنوں کے بل دونوں ہاتھوں پہ پیٹی لئے کھڑا رہا۔ دیر تک عالمِ تصویر میں رہنے کے بعد آخر انیس نے جرأت سے کام لیا۔ ہوش و حواس درست کر کے رُکتے رُکتے شرمیلی آواز سے بولی "کیا تم مسلمان نہیں ہو جو رات کے وقت خدا و رسول کے حکم کی توہین کرنے کو ایک غیر گھر میں، ایک اجنبی دوشیزہ کی خواب گاہ میں اس طرح درانہ گھس آئے؟ تمہارا یہ رویہ بڑا خوفناک ہے۔ اب میں کیا کروں کہ

میری اور تمہاری جان و آبرو خطرہ سے بچے'' احمد نے بغیر سر اٹھائے جواب دیا "رشکِ قمر! دریائے محبت کی طغیانی مجھے یہاں بہا لائی ہے، میں نے ایک مرتبہ تمہیں دیکھا تھا۔ دوبارہ دیکھنے کی آرزو تھی۔ تمہاری زلفوں کا قیدی ہوں۔ حسرتِ دیدار نے ٹوکرے میں بند کیا اور کشاں کشاں لے آئی۔ اگر تمہاری نظروں میں میرا یہ جرم قابلِ سزا ہے اور تمہارے دل میں رحم و کرم کا کوئی جذبہ نہیں تو بسم اللہ خنجر میاں سے نکالو۔ گردن جھکی ہوئی اور سینہ بے پردہ حاضر ہے۔ ؎

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

یہ سن کر انیس نے خنجر زمین پر پھینک دیا اور کہنے لگی "ایسا نہیں ہو سکتا، سچ ہے، "مجرمِ عشق بھی گردن زدنی ہوتے ہیں؟" احمد کو یہ ڈر کب چاہیے تھا۔ اس نے جھک کر انیس کے پاؤں چوم لئے اور انیس نے دھڑکتے ہوئے دل رعشہ دار ہاتھوں سے، احمد کو اٹھا کر اپنے برابر بٹھا لیا +

دوسرا باب

دو دل رضی تو کیا کرے گا قاضی۔ انیس جلیس کے والد حسیب کی ناں ٹوٹ گئی۔ شادی ہوئی اور احمد انیس کو اپنی محلسرا میں دلہن بنا کر لے گیے۔ دو سال کا طویل عرصہ بڑے سکھ چین کے ساتھ بسر ہوا۔ دونوں خوش جیسے جنتی اور حور۔ احمد انیس کی صورت اور سیرت، ایک ایک چیز کی تعریف کرتا۔ اور بے تکان کیے جاتا۔ احمد کی آنکھیں انیس کے نظارہ کیلئے نرگس کی طرح کھلی رہنے کے لئے مجبور تھیں۔ وہ اسے ہر وقت اس طرح نگاہوں میں رکھتا جیسے مالی پھولوں کو۔ اس کے میلان و رجحان کا خیال رکھتا۔ اس کی خوبیاں۔ اس کے کمالات اسکی ادائیں، اس کے مذاق کی تصویریں بنا بنا کر دل کی آرٹ گیلری میں سجاتا۔ تعجب یہ تھا کہ احمد جیسا عشق کا بندہ، من کا موجی، ہر قید سے آزاد اور بیوی کا غلام، غلام بھی کوڑیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ حیرت اس کی تھی کہ انیس کی پرستاری نے اس کے دل کو مسرتوں سے اسقدر معمور کر دیا تھا کہ انیس کے سوا اس کے وہم و گمان میں بھی کوئی دوسری صورت نہ آتی۔ دوسری شادی کا تو کیا ذکر کسی عورت کو حرم بنانے کا تصور تک پیدا نہ ہوتا۔ یہ باتیں اس زمانہ میں نہ شرافت کے خلاف تھیں نہ محبت کی شریعت کا جرم۔

انیس احمد کی محبوبہ بھی تھی اور خادمہ بھی۔ احمد اس کا آقا بھی تھا اور بندۂ عشق بھی۔ اطاعت خدمت، وفا اور دلداریوں کے مکتب میں دونوں ایک دوسرے کے استاد تھے۔ یہ نہیں کھلا کہ ان خوشگوار تعلقات میں انیس کے حسن کی کارفرمائی تھی یا محبت کا دخل تھا۔

بہرحال حریفین کا ہر مطالبہ رضاکارانہ پورا ہوتا۔ اب اس میں انیس کی فطری قابلیت یا استعداد سمجھو یا احمد کا شعور اور نفسیاتی ادراک کہ اس نے انیس کے رجحان کے خلاف نہ کوئی مطالبہ کیا نہ اس کی طبیعت سے انحراف۔ اس لئے احمد کو روز انیس میں نت نئی خوبیاں نظر آتیں۔ وہ اس کی ایک ایک ادا پر مٹا جاتا۔

حسن کے ساتھ اگر کسی میں وفاداری اور عقلمندی کے جوہر بھی ہوں تو وہ قتل نہیں مسیحا ہے۔ انیس کی صورت لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید کے تخیل میں حسین نہ تھی بلکہ وہ جمالیات کا پتلا تھی۔ اس کے نازک پاؤں جنہیں احمد نے سب سے پہلی مرتبہ رات کو جبکہ اس کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا تھا دیکھے تھے، حسن کا زینہ کہنا چاہیئے۔ ہاتھ دلوں کو مسلنے والے۔ ناخن حنائی۔ انگلیاں چمپا کی کلیاں۔ بھویں اونچی محرابدار اور سیاہ۔ کالے کالے بالوں میں مہندی لگی ہوتی۔ جیسے اندھیری رات کو شفق پھولے۔ روشن اور کشادہ پیشانی بے ترتیب پڑے ہوئے بالوں میں سے اس طرح چمکتی تھی جس طرح بادلوں میں سے چاند۔ اف!

جہاں دلوں میں ہم آہنگی اور محبت روز افزوں ہو، سامان عیش کی کیا کمی، جذبات کی دنیا آباد ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اپنی دلچسپی اور انیس کے شوق کی خاطر احمد ہندوستان کی رقاصہ لونڈیاں لایا۔ جن سے تعلیم پاکر وہ تنبورے اور ایرانی بربط کی گتوں پر ناچ کے کمالات دکھانے لگی۔ رقص کے لئے ایک علیحدہ کمرہ تیار ہوا۔ جس میں ترکی قالین بچھا ہوا تھا۔ افریقہ اور ایشیا کے جواہرات اور زیورات، نئی نئی تراش خراش کے لباس اور زینت کے قیمتی سے قیمتی اسباب اس پر نثار تھے۔ جب وہ ناچتی جس کو رقص حسن کہنا چاہیئے تو محبت کی فضا میں بجلیاں سی کوندنے لگتیں۔ گت بھرتے ہوئے اس کا کھلے ہوئے بالوں کو سر کی ایک دلربایانہ جنبش سے روشن چہرہ پر ڈالنا، یہ معلوم ہوتا کہ رات آفتاب کی پاسبانی کے لئے آگئی ہے۔ احمد فرط تلذذ سے کبھی آنکھیں بند کر لیتا اور کبھی دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا۔ وہ کبھی ہندی ناچ کی فرمائش کرتا اور کبھی بابل کی لڑکیوں کے رقص کی بہار دکھانا

چاہت۔ وہ قدیم بابل جس کے کھنڈرات پر اب پُرامن اور شاندار شہر بغداد بسا ہوا ہے۔

اسی طرح گھنٹے، دن، مہینے، اور سال گزرتے گئے، وہ ہر وقت یہ سوچتا رہتا کہ اور کیا ایسے سامان ہو سکتے ہیں جن سے انیس کا باغ حسن اور اس کا نخل محبت زیادہ سے زیادہ رنگ و بو پیدا کرے۔ ایک دن انیس احمد کے زانو پر سر رکھے گنگنا رہی تھی، فردوس کے مزے آ رہے تھے۔ اتفاق سے گزشتہ واقعات کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ انیس کی اس رات والی بات یاد آ گئی جو اس نے حوض میں پانی سے کھیلتے کھیلتے احمد سے کہی تھی کہ میرا شوہر مجھے مارے گا تو نہیں؟ احمد نے جھک کر اس کے کان میں کہا کیا میں تمہیں ماروں؟ انیس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ نرم آواز سے منہ اونچا کر کے بولی "ہاں! ضرور۔ جانبک سے!!!" "حسن فریب کار کے انداز دیکھنا!"

انیس کے اس جواب میں کچھ ایسی سادگی آمیز بھری شوخی تھی کہ احمد کے جذبہ عشق میں اور ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس نے انیس کا جمیل ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا۔ پھر اسے آنکھوں سے لگایا، چوما اور کہا "میں تمہیں اس سے بھی زیادہ سخت سزا دوں گا۔ تم میری زر خرید کنیز ہو۔ احمد انیس کے چہرہ سے اس کے اندرونی جذبات کا اندازہ لگا چکا تھا یعنی مارنے سے اس کا مطلب ناز برداری اور کوڑے سے اس کی مراد زوجیت کا اعتراف ہے لیکن جو خیال حد سے گزرا وہ بیشک مسا ہوا" محبت ہو یا نفرت سب کے درجے ہیں۔ ان کی چھوٹ اچھی نہیں ہوتی۔ خصوصاً شرعی حدود میں داخل ہونے کے بعد احمد نے اپنی بیوی کی جا و بیجا تعریف کرنے۔ اس کی زینت کے لئے دولت لٹانے اور اس کے ناز اٹھانے میں اس قدر مبالغہ سے کام لیا تھا کہ انیس اپنے کو دنیا کی کوئی عجیب چیز سمجھنے لگی تھی تاہم ابھی اس کے شوہر پرستی کا جذبہ دن دونا اور رات چوگنا بڑھتا جاتا تھا۔ اس کو ارمان تھے کہ وہ ایک باقاعدہ بیوی کی طرح اپنے شوہر کے ظلم بھی اٹھائے، محبت کے رنگ ہی نرالے ہیں، انتہائی شیرینی کا احساس ہی بغیر تلخی کے نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی

بگاڑ نہ ہو تو بناؤ کا لطف کیا؟ موسیقی سے لذت، مذوز ہونے کیلئے ٹھاٹ بدلنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مسلسل راحت ہی راحت، راحت نہیں رہتی۔ کسی ترجمانِ حقیقت نے خوب کہا ہے "بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر"

احمد اپنے زانو سے انیس کا سر ہٹا کر اونٹ کا چابک اٹھا لایا اور ہوا میں اسے پھٹکار کر سخت لہجہ میں بولا "ادھر دیکھو! کیا ارادہ ہے؟ میری اطاعت کرنی ہے یا نہیں۔ میں اس ہنٹر سے آدمی کی کھال اڑا دیا کرتا ہوں" انیس ہنسی، احمد کے قدموں کی طرف بڑھی اور اس کے دامن کو بوسہ دیا۔ احمد کا یہ اتفاقی سوانگ انیس کے طفلانہ مزاج کے موافق پڑا، وہ اپنے شوہر کی حقیقی بیوی بننا چاہتی تھی اور چونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ شوہر کی سختیاں سہنا ہی ایک بیوی کی اصلی شان ہے۔ جو شوہر اپنی بیوی سے لڑتا نہیں، وہ کبھی نہ کبھی اسے ضرور اپنے گھر سے نکال دیگا۔ اس لئے اسے احمد کی یہ حرکت بہت پسند آئی۔ اگر کوئی چابک اس کی پیٹھ پر پڑ جاتا تو شاید وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہوتی۔

اب احمد ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ یہ کھیل ضرور کھیلتا، لیکن اتنا ہی کہ کھیل کی حد میں رہے۔ وہ ایک ہوشیار باغباں کی طرح اپنے اس پھول کی نگہداشت کرتا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ میرے اپنے خانہ باغ کا پودا ہے۔ حد سے زیادہ نازک، ور ایسے گرم ملک کا جو صرف محبت کی گرمی ہی سے پرورش پا سکتا ہے۔ اس لئے ہر وقت ہاتھوں چھاؤں رکھتا اور اس کے رنگ و بو پہ کوئی آنچ نہ آنے دیتا۔ اس خاطرداری کا یہ نتیجہ نکلا کہ رفتہ رفتہ انیس کی بچپن کی خو جاتی رہی اور وہ حقیقی معنوں میں احمد کی ہمدم و ہمجلیس ہو گئی۔ ہمدم و ہمجلیس کیا، وہ قالب تھی اور احمد روح، اس کی زندگی اس کے سہارے اور آسرے پر گزرنے لگی۔ دن کو جب وہ دکان پر جاتا یہ بیجان مورت کی طرح چپ چپ پھرائی ہوئی آنکھوں سے دروازہ کو تکا کرتی کہ کب اس کا چلانے والا آتا ہے؟ احمد کی صورت دیکھ کر اس کی جان میں جان آجاتی۔ دل کی مرجھائی ہوئی کلی اور پژمردہ رخسارے چاندنی کے پھولوں کی طرح کھلنے لگتے۔

اس کے آگے اور پیچھے اس فنائیت سے پھرتی جیسے پروانہ شمع کے گرد۔ احمد کے ساتھ اس کا دل اسقدر وابستہ ہو چکا تھا کہ اگر اس جوہری بچہ کے مقابلہ میں تخت شاہی بھی پیش کیا جاتا تو انیس بلا تامل اسے ٹھکرا دیتی۔

یوں کہنے کو بہت سی باتیں ہیں مگر اصل یہ ہے کہ احمد نے اپنی ذات اور انیس کی صفات کو محبت اور خلوص کے ایسے چمن میں بار آور کیا تھا جہاں حسد کی پود ہی نہیں اگتی۔ بدگمانیوں کی خزاں کے جھونکے ہی نہیں آتے۔ ان کیلئے دنیا دنیا نہ تھی جنت تھی اور یہ دونوں نجات پائے ہوئے جنتی۔ احمد ناشکرا نہ تھا۔ محبت اور شادکامیوں نے تو اس کے احساس بہت ہی تیز کر دئے تھے۔ اسے اکثر اپنا باپ یاد آتا۔ مرنے سے قبل جو اس پیر مرد نے الفاظ کہے تھے اس کے کانوں میں گونج اٹھتے کہ "اصلی راحتوں کا مرکز گھر ہے۔" اس میں شک نہیں کہ احمد نے جو چیز اپنے پریشان خوابوں میں بھی نہیں دیکھی تھی وہ آج کھلی آنکھوں دیکھ رہا تھا اس لئے جب مرحوم باپ کی تصویر اس کے سامنے آتی وہ بنظر تشکر وامتنان آسمان کی طرف دیکھتا جہاں بزرگ محمود پہنچ چکا تھا اور اس کی بخشش کی دعائیں کرتا۔

دنیا کی ہر شے زوال پذیر ہے۔ زوال نہیں تو صرف اسی ایک ذات کو جو حی و قیوم ہے! اس مدت میں انیس نے بچپن سے جوانی کی طرف جو جو قدم اٹھائے۔ احمد نے تعجب انگیز ترقی دیکھی۔ بچپن اور جوانی کے درمیان کا زمانہ عجیب نازک مگر حسین دور ہوتا ہے۔ عمر بھر اس کی یاد آتی رہتی ہے۔ اسے بیت الغزل کہنا چاہئے۔ احمد اور انیس کی شادی کو جب دو سال ہو چکے یعنی شاعرانہ زندگی کے چوبیس ہلالی پھیرے اڑاتے ہوئے جہاز وقت کے سمندر میں بہ گئے تو یہ ذرا چونکے۔ اگرچہ اب بھی انیس میں اس دوشیزگی کی جھلک موجود تھی جس پر شباب غالب آتا جاتا تھا اور اس کے شوخ و شریر چہرہ پر متانت کے آثار پورے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ صنف نازک کے لئے تو یہی بہار کی فصل ہے۔ مردوں کو مسحور کرنے والی طاقتیں اسی عمر کے ثمرے ہیں۔ احمد کے علم میں یہ ساری چیزیں تھیں۔

اور وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ انیس اس کے سوا کسی کی نہیں۔ لیکن جوں جوں اس کی جوانی نکھرتی یہ ڈر چھاتا جاتا۔

احمد کو یہ خوف نہ تھا کہ اس کی منکوحہ خدانخواستہ بے وفا ثابت ہو گی۔ شباب کا جوش اسے کہیں ابھارے جائیگا یا اس کی دسترس میں بھی حُسن کے "چِٹے" پرائی عصمتوں کے دشمن اور جھوٹی محبت کے چور نقب لگانے لگیں گے۔ بلکہ اس کے دل پر یہ دہشت چھا گئی تھی کہ اس کی محبوبہ جس طرح طفلی سے شباب کی سرحد میں داخل ہوئی اسی طرح کوئی دن میں شیب کی منزل آ جائے گی۔ حسن کا ہلال جو بتدریج بدر بن رہا ہے کامل ہو کر گھٹے گا اور دنیا کی دوسری فانی اشیا کی مانند ایک روز اس کی تمام دلفریبیاں جاتی رہیں گی۔

"بقا اور قیام تو اسی کا حق ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا" اور احمد کا یہ اندیشہ قانون فطرت کے خلاف سہی، کچھ بیجا اور بزاوہم نہ تھا۔ انیس کے انداز طفلی باریک نقابوں میں برابر چھپتے چلے جا رہے تھے، ان نقابوں میں جو روز بروز گہری اور دھندلی ہوتی جاتی تھیں۔ ان تغیرات کو سیدھے سبھاؤ دیکھنے والی نظریں کیا تاڑ سکتیں، احمد چونکہ پرانا گاہ باز تھا، دریائے حسن کے بیسیوں مدوجزر اس نے دیکھے تھے۔ انیس کی شوخی کو متانت سے بدلتے ہوئے اس کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ اس لئے اس نے اندازہ لگا لیا کہ عروج کا ڈانڈا زوال سے ملنے ہی والا ہے اور یہ روز بد جو رونا چار دیکھنا ہی پڑے گا۔ ورنہ ستانی بستم می رسد۔ اور اب انسانوں اور انسانوں کی عیش طلبیوں سے اس کو ذرہ برابر حسد نہ رہا تھا بلکہ وہ وقت اور زمانہ سے نفرت کرنے لگا۔ اس خوف اور یقین کیساتھ کہ اس کا چکر ناقابلِ مقاومت ہے۔ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ اپنا دور پورا کرے اور کیے۔

اکثر احمد اپنے ان تخیلات میں کھو سا جاتا۔ وہ دل میں کہتا کہ قدرت کا جمال تو فنا نہیں ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ گلزار فطرت موسم سرما میں خوابیدہ رہتا ہے۔ لیکن فصل بہار

لسے بیدار کر دیتی ہے۔ کلیاں چٹکتی ہیں۔ زمین پھر سر سبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ ساری دنیا آج بھی ایسی ہی بارونق نظر آتی ہے جیسی روز آفرینش میں تھی۔ لیکن اندھیرا اجالا بہار و خزاں، رنج و راحت، ہنگامی سہی، ہے تو سہی۔ اس کا کیا علاج؟ کاش خدا نے انیس کو پیدا ہی نہ کیا ہوتا! انیس کی خوبصورتی اگرچہ فطرت کا عطیہ تھی، بناوٹی رعنائیوں کو اس میں مطلق دخل نہ تھا، تاہم اس کی بے ثباتی کے خیال سے احمد کو بڑی کوفت ہوتی اور وہ محسوس کرتا کہ جن شیرینیوں سے شیریں کام ہونے کا اسے ہر صبح و شام موقع ملتا ہے ساعت بہ ساعت تلخ تر ہوتی جاتی ہیں۔

انیس کو احمد کی اس تشویش کی کیا خبر؟ اسے شبہ تک نہ تھا کہ اس کی موجودگی میں اس کے شوہر کا دل مسرتوں کی بجائے غموں کا مرکز بھی بن سکتا ہے۔ وہ بدستور اپنی عشوہ گریاں، ناز و انداز دکھانے اور خاوند کی دلجوئیوں میں مصروف رہتی۔ افکار سے آزاد، نشۂ حسن و جوانی میں مست، سبزہ زار کے خوشنما پھول کی مانند شگفتہ دکھائی دیتی۔ اس کی گفتگو سے کبھی سنجیدگی اور دانائی ٹپکتی۔ کبھی بچپن کی بے نیازیاں، کبھی بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتی اور کبھی تتلی چکور بہار چمن میں اٹھلاتی پھرتی۔

غمگین اور خوش چہرہ چھپا نہیں رہتا۔ بیٹھے بیٹھے بےچین ہو جانا۔ ہنستے ہنستے منہ پھیر لینا آخر انیس کو کھٹکنے لگا۔ محبت کی نگاہیں بڑی تیز ہوتی ہیں، باوجود انتہائی احتیاط کے وہ بھانپ گئی کہ اس کا شوہر کسی غیر معمولی فکر میں مبتلا ہے، ایسا فکر جسے وہ مجھ پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ رشک و حسد یا بدگمانی تو نہ اس کی فطرت میں تھی نہ ان بنیادوں پر خیالی عمارت چننے کی وجہ۔ اس کے خیالات پاک تھے۔ اس لئے شروع شروع انیس نے اپنے شوہر کا دل ٹٹولنے کی بجائے اس کا دل بہلانے کی کوشش کی۔ بناؤ سنگار میں روز جدتیں دکھاتی۔ نئے نئے گیت گاتی۔ طرح طرح سے اپنے جوانی سے بھرپور حسن کی نمائش کرتی۔ اور یہ سب اس غرض سے کہ احمد کی تخیلی فضا مکدر نہ رہے، وہ حسن و محبت کے

تماشوں میں محو ہو کر طبیعت کی بدمزگی کو بھول جائے۔ لیکن جب یہ ساری ترکیبیں بے سود ثابت ہوئیں، نہ احمد کھلانہ اس کے اضمحلال میں فرق آیا تو انیس کو ایک اور تدبیر سوجھی عقلمند بیوی نے تجزیہ کار مشیر کی حیثیت سے ایک تفریحی سفر کا مشورہ دیا۔ اس نے خیال کیا کہ انسان ایک حالت میں رہتے رہتے، خواہ وہ حالت کیسی ہی تعیشانہ ہو، اکتا جاتا ہے۔ شاید تنوع کے فقدان، روزانہ ایک قسم کی زندگی، یہی آسمان یہی زمین یہی گھر یہی باغ اور یہی تمدن دیکھتے دیکھتے احمد کا دل بھر گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ چند روز کیلئے اس ماحول کو بدلا جائے۔ سفر کو وسیلۃ الظفر کہتے ہیں۔ ممکن ہے جگہ کی تبدیلی، راستہ کا انہاک اور نئے نئے مقامات کے سیر و تماشے فرحت و انبساط تازہ کا سامان پیدا کر دیں۔

اس تجویز کے تحت میں انیس کبھی دریائے جیحوں کے آبی سفر کی کیفیتیں سناتی اور کبھی عظیم الشان قافلے کی دشت پیمائیوں کا بڑے دلچسپ پیرائے میں تذکرہ کرتی تاکہ احمد کے دل میں سیر و سیاحت کا شوق پیدا ہو مگر باتوں سے کہیں رات کٹتی ہے۔ وہ سرسری طور پہ ہاں میں ہاں ملا کر ٹال جاتا۔ آخر اس نے خوشامد اور متانت سے زور دینا شروع کیا۔ اور ایک دن موقع دیکھ کر بولی "میرے آقا! اگر آپ اپنی تفریح کے لئے سفر نہیں کرنا چاہتے تو میری خاطر سہی، اس کنیز کا کیا اتنا بھی حق نہیں کہ اس کی ایک ادنیٰ درخواست قبول کی جائے۔ آپ نے بارہا کس شوق سے میرے سامنے سمندر کے عجائبات کا ذکر کیا ہے اور دمشق و ایران کی کیسی کیسی تعریفیں کی ہیں۔ کیا وہ صرف اس لئے تھیں کہ کان سنیں اور آنکھیں ترسیں؟" یہ کہتے ہوئے انیس کے تخیل کی پرواز احمد کے طائر فکر سے بھی زیادہ بلند ہو گئی تھی اور اس لئے تھوڑے وقفہ کے بعد اس نے اپنے خاموش شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھر کہا "لونڈی کی عرضداشت قبول نہیں ہوئی! اچھا اب نہ کہئے گا ؎

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ　　　ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

لیکن احمد کیا جواب دیتا، یہ نہیں کہ انیس کی خاطر منظور نہ تھی۔ دراصل وہ اپنے چاند کو ایک ہی صورت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ حال سے بدر اور بدر سے سیخ ہونے میں جتنی خوبیاں اور مصلحتیں ہیں اس کے نزدیک ہیچ تھیں۔ انیس کے شباب کی تبدیلی کے خیال نے اس کے دل پر ایسی ہیبت بٹھائی تھی کہ وہ تبدیلی آب وہوا اور نقلِ مکان کے نام سے بھی تھراتا تھا۔ تاہم اسے اپنی رفیقِ حیات کے اصرار سے مجبور ہونا پڑا۔ سفر کی حامی بھرتے ہی بنی۔ فیصلہ ہو گیا کہ ذرا جھلسنے والی دھوپ کی تمازت کم ہو جائے تو چلیں گے۔

قصہ مختصر مقررہ موسم آ گیا، وقت کو گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ سفر کی تیاری تو ہفتوں پہلے سے ہو رہی تھی نہ بھی ہوتی تو سہ

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست   هر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

مگر یہ بھی انیس کا حکم تھا کہ راحت کے سارے سامان گھر سے لے کر چلا جائے صحرا کا سفر ہے نہ جانے کیا موقع پیش آئے۔ چنانچہ احمد نے اپنے سامنے اونٹوں پر ڈیرے تنبو، کھانے کا سامان، تر خشک میوے۔ لباس کے صندوق۔ پانی کی پکھالیں اور دوسری ضروری چیزیں لدوائیں۔ کئی درجن لونڈی غلاموں کے ساتھ بغیر منزل مقصود کا خیال کئے انیس جلیس کو شغدف میں بٹھا چل کھڑا ہوا۔ منزلِ مقصود کیا؟ کوئی مقصد ہوتا تو منزل بھی ہوتی۔ صحرا نوردی کہو یا انیس کے خیال کی ایک رو جس میں یہ مختصر سا قافلہ بہا۔

عام شاہراہ سے الگ، لق و دق بیاباں میں جہاں نہ چرند و پرند نظر آتے نہ پانی کا پتہ تھا۔ تین دن تک یہ محبت کے سراب کا فریب خوردہ کارواں برابر چلتا ہی رہا تیسرے روز جب سورج غروب ہو گیا، احمد نے راوٹیاں کھڑی کرنے کا حکم دیا۔ صحرا دور دور تک سنسان، اندھیری رات۔ آسمان پر ستارے اور تنبوٹیوں میں موی شمعوں کی روشنی، عجیب سماں تھا، مگر احمد کی طبیعت جوں کی توں تھی۔ انیس کی طرف دیکھتا، ٹھنڈے سانس بھرتا اور سر نیچا کر لیتا۔ خدا جانے کیا خیال آیا۔ ایک غلام سے اذان دلوائی،

وضو کیا، نماز پڑھی اور دیر تک مصلے پر بیٹھا دعا، گنت رہا۔ انیس نے بہت چاہا کہ کوئی بات کرے۔ رات کٹے۔ دل بہلے لیکن اس کی چپ کے آگے ایک نہ چلی۔ تھکے ہوئے تھے۔ لیٹ گئے۔ دو دراتیں اونٹ پر ٹنگے ہوئے گزری تھیں، نیند آ گئی۔ صبح اٹھ کر احمد نے نوکروں کو تو وہیں چھوڑا اور انیس کا ہاتھ پکڑ ایک اونٹ پر بیٹھا ریگستان میں ایک طرف نکل گیا۔ چلتے چلتے ایسی جگہ پہنچے جہاں حق اللہ پاک ذات اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ ساتھی بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ احمد کو محسوس ہوا کہ انیس کانپ رہی ہے۔ اس نے اونٹ کو روک کر پوچھا "کیا تمہیں ڈر معلوم ہوتا ہے؟" انیس جو آگے بیٹھی ہوئی تھی یہ سن کر مڑی۔ دونوں ہاتھ احمد کے کندھوں پر رکھ دئے اور جواب دیا۔ "نہیں، میرے سرتاج! تمہارے ہوتے مجھے کس بات کا ڈر؟"

چاروں طرف ریت ہی ریت تھا، آدم زاد کیسا، کسی جاندار کی پرچھائیں تک نہ دکھائی دیتی تھی، ریت کے ذرے نکلنے والے سورج کی شعاؤں پر ناچتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ احمد اونٹ پر سے اتر پڑا۔ انیس کو اتارا۔ اونٹ کو ایک ٹیلے کے پاس چھوڑ دیا اور خود انیس کو لیکر پاپیادہ آگے بڑھا۔ آگے آگے وہ تھا اور پیچھے پیچھے انیس۔ کچھ دور جا کر اس نے انیس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "انیس۔ سنتی ہو! ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، بیحد محبت، اور محبت دنیا کے ہر خطرہ پر غالب آ جاتی ہے۔ اس لئے محبت کرنے والا ڈرتا نہیں، وہ بے جگر ہو کر تقدیرات کا مقابلہ کرتا ہے۔" انیس نے جواب دیا میں بھی نہیں ڈرتی۔ الحمد للہ مسلمان ہوں، محبت کرنے والی، مجھے تم موت تک کے مقابلہ میں بھی تیار پاؤ گے۔" انیس کے اس جواب پر احمد کا دل بھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ "لیکن مجھے ڈر ہے انیس کہ تمہارا حسن و شباب پر تول رہا ہے ایسا نہ ہو زمانہ کا شکاری چھاپہ مار دے اور میں دیکھتا کا دیکھتا رہ جاؤں۔"

انیس زرد پڑ گئی، اس کا جسم کانپنے لگا۔ ایک گہرا سانس لے کر بولی "خدا ہی حافظ و ناصر

ہے"۔ اے میرے مالک آخر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" احمد کو اپنی محبوبہ کی آنکھوں میں ایک خوفزدہ ہرنی کی سی کیفیت دیکھ کر اور اس کے اس فقرہ کی گہرائیوں سے متاثر ہو کر بہت شرم آئی' وہ منہ پھیر کر بولا "تم! میری انیس! تم!! ضرور ایک پاک دل اور وفا کی دیوی ہو' مگر میں دیوانہ ہو گیا ہوں' مجھ پہ توہمات غالب آ گئے ہیں۔ مدافعت کی اگلی سی طاقت مجھ میں نہیں رہی۔ میں پہلے کی طرح تمہاری عنایتوں سے متمتع نہیں ہو سکتا! آہ! آہ!! یہ وہم میری زندگی کو تباہ کئے ڈالتا ہے کہ تم' تمہاری ہر چیز اور جو کچھ تم نے مجھے دیا۔ سب فانی ہے اور مٹ کر رہے گا۔ اسی مستقبل کے خیال نے میرے احوال کو اندوہناک' میری روح کو بیمار ڈال کر ساری موجودہ مسرتوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں ظاہر میں زندہ اور باطن میں مردہ ہوں۔

ایک محبت کی متوالی' شوہر پرست عورت اپنے مرنے والے کی زبان سے اس طرح کی باتیں سُنے اور اس کے دل پر چوٹ نہ لگے۔ انیس ایک چیخ مار کر والہانہ انداز میں احمد سے لپٹ گئی۔ گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں کو چوما۔ اب اسے اپنے عاشق کے غمگین رہنے کی اصلی وجہ معلوم ہوئی۔ اس نے آنکھ اٹھا کر اپنے چاروں طرف سنسان صحرا اور اس کی مہیب فضا پر نظر ڈالی اور روتے ہوئے زور سے کہا "محمود کے بیٹے! کیا تم نے ابھی نہیں کہا تھا کہ محبت کے مقابلہ میں کوئی خوف نہیں ٹھہر سکتا۔

احمد۔ ہاں کہا تھا؟

انیس۔ اور میری بات بھی سنی تھی۔؟

احمد۔ ہاں سُنی تھی۔

انیس۔ پھر کیا مجھ پر اعتبار نہیں؟

احمد۔ افسوس۔

انیس۔ افسوس کیا یقین مانو۔ تمہیں اذیت دینے والی کوئی بلا ہو! میں سینہ سپر

ہو کر تم کو اس سے نجات دلوانے کے لئے آمادہ ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے۔

واقعی احمد کا دل کچھ جل سا گیا تھا جو بات کرتا انوکھی عشق کی افراط آدمی کو پاگل کر بھی دیتی ہے، اس کے خیالات پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے معشوق کی ہزاروں بے معنی طریق پر آزمائش کرتا ہے، اب اس کا انجام نیک ہو یا بد۔ ایسی ہی کوئی دھن، احمد کو بندھی ہوئی تھی۔ اس نے قدرے تامل کے بعد کہا "انیس جلیس! اپنی جھکی ہوئی آنکھیں اٹھاؤ۔ دیکھو تمہارے چاروں طرف یہ غیر فانی منظر ہے، ابتدائے آفرینش سے آسمان کی نیلی محراب، سورج کی دہکتی ہوئی گیند اور زرد ریت کا فرش کبھی نہیں بدلا۔ ہزاروں انقلاب آئے، یہ جیسے کے تیسے رہے۔ اس صحرا کا کچھ نہیں بگڑا۔ اس کے آزمائش کی چیزیں بدستور قائم ہیں۔

انیس۔ پھر؟

احمد۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس فنا ہونے والے ماحول کے سپرد کر دوں۔

انیس۔ بسم اللہ؟

احمد۔ (جلدی سے) اچھا اپنے کپڑے اتار ڈالو اور بال کھول دو۔

انیس نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ اس عجیب و غریب خواہش میں احمد کا کیا مقصد ہے۔ اس نے بلا پس و پیش، ایماندار بیوی کی طرح فوراً کپڑے اتار پھینکے اور بال کھول دئے۔ سورج سے دہکتے ہوئے آسمان کے نیچے، تپتی ہوئی زمین کے اوپر، ویران صحرا اور گرم ہوا کے جھونکوں میں ننگ دھڑنگ انیس بال بکھیرے کھڑی تھی اور احمد نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کے حسن کا کمال جانچنے کے تو یہ ڈھنگ نہیں تھے۔ عورت اس پر تکلف خوابگاہ میں دلکش نظر آتی ہے جہاں بخورات روشن ہوں اور فضا معطر ہو، نہ کہ اس بھیانک جنگل میں ایک قسم کا جنون سمجھو۔ بہرحال تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے کہا، "بس، انیس اب تم مجھ سے جدا ہو جاؤ، مشرق کی جانب ریت کے ٹیلوں کے اُس پار تمہارا راستہ ہے۔ چلتی رہو، چلتی رہو یہانتک کہ میں نہ دکھائی دوں۔ اور جب

پاؤں تھک جائیں، آگے نہ چل سکو، سمجھ لو منزل آگئی۔" اتنا کہہ کر احمد کچھ رکا۔ انیس چلنے لگی۔ احمد گلا صاف کرنے کے لئے کھنکارا اور گھبراہٹ کے لہجہ میں بولا "ٹھیرو۔ پوری بات تو سن لو۔ بس وہیں جہاں تمہاری طاقت جواب دیدے ٹھیر جاؤ! صحرا کی بے پناہ وسعت اور تم ہو گی۔ تنہا ہر فانی آنکھ سے اوجھل۔ اس وقت زمین پر جھک جانا۔ ریگِ رواں کے بے کنار دریا میں غسل کرنا۔ مجھے القا ہوا ہے کہ تمہارا دامنِ حیات دامنِ بقا سے مل جائے گا۔ پھر تم لوٹ کر میرے پاس آسکتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ آج کے بعد آئندہ تمہیں کسی قسم کی ماندگی سے واسطہ نہیں پڑے گا۔ بقائے دوام کے سارے پوشیدہ راز تم پر آشکارا ہو جائیں گے اور میری آنکھیں ہمیشہ تمہیں یکساں خوبصورت دیکھ سکیں گی۔"

یہ صحرا کوئی طلسم تھا اور اس کی فتح اس ترکیب پر منحصر تھی۔ یا جادو اتارنے کا منتر۔ انیس نے احمد کی ہدایتیں بغور سنیں۔ مطلب تو کیا خاک سمجھتی تاہم اس نے ایک عقیدتمند مرید کی طرح ان کا احترام کیا۔ اپنے شوہر کی پیشانی پر ایک مرتبہ اور بوسہ دیا۔ اور سر جھکا کر خاموش رخصت ہو گئی۔ ریت پولی تھی۔ اس کے پاؤں ٹخنوں تک اتر گئے۔ چلنا دشوار تھا لیکن ہمت کے قدم کب رکتے ہیں، وہ برابر چلی جاتی تھی۔ احمد کبھی اس کے سایہ کو دیکھتا اور کبھی اس کو۔ جاتے جاتے تھوڑی دیر میں اس کی پرچھائیں دھندلی ہونی شروع ہو گئی اور وہ ریت کے زرد ٹیلوں میں چھپ گئی۔ انیس کا نظروں سے اوجھل ہونا تھا کہ احمد کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سجدہ میں گر پڑا۔ دعا مانگنے کی کوشش کی۔ دل دماغ زبان سب بے قابو۔ سر ریت پر تھا۔ خیالات ریگ کے ذروں کی طرح منتشر۔ دعا بھی اطمینانِ قلب سے ہوتی ہے۔ ناقابلِ برداشت بےچینی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ آفتاب نصف النہار پر جا پہنچا۔ انیس اب آتی ہے نہ جب۔ احمد کا اضطراب؟ ایک ماہیِ بے آب تھی کہ گرم وخشک ریگ پر تڑپ رہی تھی۔ اس کی آس اب صرف اسی قادرِ مطلق سے تھی جسے جامع متفرقین کہتے ہیں اور اب یہ فقط تائیدِ غیبی کا

منتظر تھا۔

ایک عجیب بے نتیجہ خیال جس کی ہیبت دونوں سے احمد کو گھیرے ہوئے تھی۔ غالب آیا "نیس جیسی پاکیزہ صورت وسیرت والی عورت کے ساتھ میں نے شادی کرکے سخت غلطی کی"! ان تصورات نے اس کے دماغ کی صحت کھو دی' وہ پھول کے رنگ و بو کی فنا و بقا میں ایسا الجھ کہ اس کی شاخ ہی کو توڑ مروڑ ڈالنا چاہا۔ اس نے اپنی بیوقوفی سے سوچا کہ جس چراغ کو ہوا بجھانے والی ہے میں اپنے ہاتھ سے کیوں نہ بجھا دوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ وہ انیس کی بہار کو خزاں ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اور اس لئے احمد نے اس روحی عذاب سے نجات اسی میں دیکھی کہ کسی طرح خود انیس ہی سے چھٹکارا حاصل کرے۔

لیکن یہ بھی اسی دماغی بیماری کا ایک دورہ تھا' محبت جیسی بیرن جو سوئے نہ سونے دے اس کا پیچھا کب چھوڑتی تھی۔ احمد کے کلیجہ میں درد بن کر چپکنے لگی۔ زیادہ دیر صبر نہ کر سکا۔ لپک کر انیس کے کپڑے اٹھا لئے' اس کے جسم کی خوشبو ان میں بسی ہوئی تھی' چوما' آنکھوں پر رکھا اور انہیں سینے سے لگائے بے تحاشا انیس کے نقشِ قدم پر دوڑ پڑا۔ انیس صرف آنکھوں سے اوجھل تھی۔ فصل کچھ زیادہ نہ تھا۔ ریت کے دو ٹیلے طے کرتے ہی انیس کے پاس جا پہنچا۔ وہ واپسی کے لئے مڑی ہی تھی کہ دونوں کا سامنا ہوا۔ اب احمد پر ایک دوسری حالت طاری ہو گئی دونوں ہاتھ خدا کی جناب میں شکریہ کے لئے اٹھ گئے۔ انیس اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں بہ رہی ہیں اور بدن لرز رہا ہے۔ ایسا رقت انگیز منظر اس سادہ لوح نے کبھی کاہے کو دیکھا تھا۔ سمجھی کہ شاید یہ اس سحر کے ٹوٹنے کا اثر ہے جس کی بابت اس نے پردے پردے میں کچھ کہا تھا۔ اس لئے وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ احمد کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دئے اور اظہارِ دردمندی میں صرف اس کا نام لے سکی۔

طرفین کے جب حواس درست ہوئے' دلوں کی بھڑاس نکل چکی تو وہاں سے واپس ہوئے' اونٹ مل گیا تھا۔ دونوں سوار ہوئے اور اپنے مختصر سے قافلہ میں جا ملے۔ آگے کہاں

جاتے۔ سامان باندھ بوندھ گھر کا راستہ لیا۔ محلسرا میں پہنچے۔ سب طرف شادمانی تھی مگر انیس کا چہرہ افسردہ جیسے کمھلایا ہوا گلاب کا پھول۔ انوکھے واقعات، نرالی باتیں اور دل میں ہزاروں سوالات صفائی سے پوچھے تو سوتی بھیڑ کے جاگنے کا اندیشہ، پھر بھی گھٹتے گھٹتے کلیجہ منہ کو چلا آتا تھا۔ آخر نہ رہ سکی غمگین لہجہ میں پوچھا "احمد تمہاری محبت کو تسکین ہو گئی؟" جوہری نے جواب دیا "میری ملکہ اطمینان رکھو، میں یقین دلاتا ہوں کہ میری روح اور میرا جسم دونوں تمہارے ہیں" کوئی وجہ بظاہر نہ تھی کہ انیس اپنے شوہر کے اس بیان پر جرح کرتی۔ وہ چپ ہو گئی اور اسے کسی قدر اطمینان ہو گیا۔

تیسرا باب

ان واقعات کے بعد کچھ عرصہ تک احمد کی طبیعت خاصی سنبھلی رہی۔ فضائے محبت میں کوئی بے چینی نہیں پائی گئی فنا اور بے ثباتی کا خیال معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل و دماغ سے مٹ گیا ہے۔ انیس جلیس بربط پہ فارسی عربی اشعار گاتی رقص کرتی، ناز و انداز دکھاتی، کبھی مقدس شکل بنا کر کلام اللہ کی بعض حسب موقع حسب حال صورتیں جو اسے حفظ یاد تھیں نہایت خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کرتی اور ان کی تفسیر میں علما کی موشگافیوں سے وہ وہ مطالب نکالتی کہ احمد جھوم اٹھتا۔ کاش قرآن کریم کے یہ خود ساختہ اور ایک دوسرے پر جرح و قدح کرنے والے مفسر اتنے کج بحث نہ ہوتے اور ان کی علمی مہمات سے حیات انسانی کی تفسیر واضح ہو جاتی۔ غرضکہ انیس کا جہاں تک بس چلتا احمد کو خوش رکھتی۔ ہر وقت اس کی دلداری میں لگی رہتی اور جس طرح ممکن ہوتا کسی پریشان خیال کو اس کے دماغ پر مستولی نہ ہونے دیتی۔

اندرونِ خانہ تو احمد کی دلچسپی کے یہ سامان تھے۔ باہر کاروبار کی مصروفیت میں بہت سا وقت کٹ جاتا تھا۔ فرصت کے چند لمحے جن میں اندیشہ تھا کہ پرانا تخیل نہ لوٹ آئے، وہ شہر کے بعض حصوں میں گزار دیتا۔ اس کی تفریح گاہوں میں کارواں سرائیں بھی تھیں۔ اس وقت کا تو پوچھنا کیا، سرائیں یا مسافر خانے آج بھی منقبض طبیعتوں کو شگفتہ کرنے کیلئے نادر مقامات ہیں۔ مختلف اقلیم کے تماشے ایک چھوٹے سے احاطہ میں دیکھ لو۔ احمد جب کبھی

تفریح کے لئے نکلتا تو کارواں سراؤں کے پاس سے ضرور گزرتا اور گزرتا تو اندر جا کر ایک گشت ضرور لگاتا۔ سوداگروں اور بردہ فروشوں کی رونقیں ایک طرف، یہاں کی اصلی دلچسپ چیز قلندر اور درویش تھے۔ جو کبھی قلندرانہ رقص میں مصروف ہوتے۔ کبھی ہاتھ چلا چلا اور لمبی لمبی ڈاڑھیاں ہلا ہلا کر عجیب بے تکی باتیں کرتے۔ احمد ان کی محفل میں معتقد بن کر تو آتا نہ تھا جو ان کی مشیخت آمیز کج بحثیوں کے معنی پیدا کر کے سر ہلاتا۔ ان سے زیادہ موت و زیست اور عدم و وجود کے متعلق معلومات تو اس کی انیس کو تھی۔ اور جس نزاکت سے ان مسائل پر وہ روشنی ڈالتی یہ تاریک ماحول والے کیا جانیں۔ اس کا منشا تو کچھ وقت گزارنا تھا۔ کیونکہ صحرا کے سفر نے اگرچہ احمد کی پہلی حالت میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی تھی لیکن، دُن دماغ کہیں سکون سے رہ سکتا ہے۔ حیات بعد الممات کی الجھن نے آگھیرا۔ گئے تھے روزے بخشوانے نماز گلے پڑ گئی۔ صوفیوں کی ہو حق سنتے سنتے یہ نیا روگ لگ گیا۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے احمد کا بھی حشر نشر، دوزخ، جنت اور دوسری زندگی پر ایمان تھا۔ اور جب کبھی شکوک وشبہات کا ہجوم ہوتا:۔ نہ محبت اور نہ انیس کا حسن اسکی تسکین کرتی اور وہ گھبرا اٹھتا تو اسے مذہب ہی کے دامن میں پناہ لیتے بنتی۔ پانڈے جی پچھتائیں گے پھر چنے کی کھائیں گے۔ آخر اسے یقین سا ہو چلا کہ ایک ایسے راز کے پیچھے پڑ کر مفت اپنی جان کو گھلانا جسے آجتک نہ کوئی فلسفی کھول سکا نہ کسی عالم نے اس پر روشنی ڈالی بالکل فضول اور عبث ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان تصورات ہی کو دل سے نکال ڈالا جائے کہ

ع کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمارا

پھر؟ آنکھوں کے سامنے جو رات دن سماں بدل رہا ہے اس کا کیا علاج؟

ع رات دن گردش میں ہیں سات آسماں

وقت کی برق رفتاری کے ساتھ عمر کا توسن میدانِ حیات کو پامال کرتا چلا جاتا ہے۔ بچپن کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد بڑھاپا، یتن ٹھوکریں ہیں، زندگی میں کھانی ہی پڑیں گی باوجود یہ سب کچھ جانتے اور سمجھنے کے احمد بھی چاہتا کہ انیس کے لئے تو قدرت کا یہ اٹل قانون بدل ہی جائے تو اچھا، کاش وہ آخر دم تک جوان ہی رہتی۔

یہ باتیں تنہا احمد اپنے دل ہی سے نہیں کہا کرتا تھا بلکہ انیس کے سامنے بھی اپنی ان تمناؤں کو دہرتا۔ عورت کا ایمان مردوں کی نسبت زیادہ پکا ہوتا ہے۔ وہ جواب دیتی "تھوڑی دیر کیلئے مان لیا کہ خدا نے آپ کی اس خواہش کو پورا کردیا۔ یہ امر محال ممکن ہوگیا مرورِ ایام کے باوجود میں جوان ہی رہی۔ تو آپ اپنی کہئے؟ آپ کو بھی تو ایک دن بوڑھا ہونا ہے۔ میں بوڑھی نہ ہوئی۔ آپ بوڑھے ہوجائیں گے اور بوڑھے جوان میں پھر وہی اجنبیت رہے گی بہرحال ہم دونوں کو مکمل خوشی کیونکر حاصل ہوسکتی ہے؟" احمد کہتا "اللہ اکبر انیس تم بڑی منطقی ہو، مگر ایسا کیوں نہ ہو کہ مرتے دم تک نہ فقط میں اور تم دونوں جوان رہیں بلکہ انسانی نسل کے ہمیشہ جوان رہنے ہی کا قانون ہو جائے۔ عمر زیادہ نہ سہی کم سہی، گزرے تو جوانی میں۔"

تقریباً روزانہ اسی طرح کے سوال و جواب ہوتے۔ ایک دن یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ انیس ٹھنڈا سانس لے کر بولی "ایک بات میری سمجھ میں آئی ہے۔ اللہ میاں شاید اس طرح آپ کی آرزو پوری کردیں۔" (احمد نہایت تعجب سے انیس کی صورت دیکھنے لگا) "سنئے۔ میری ایک بڑی بہن تھیں۔ کوئی چار برس کا مجھ میں ان میں چھٹاپا بڑاپا تھا۔ عین جوانی میں انہیں موت آگئی۔ اپنے ہوش میں پہلی مرتبہ میں نے ان کو مرتے دیکھا۔ وہ سماں میں نہیں بھول سکتی۔ دس سال گزر چکے ہیں، ان کی صورت میرے سامنے ہے۔ بسترِ مرگ پر ان کے شباب کو مسکراتے ہوئے برابر دیکھتی ہوں اور جب تک زندہ ہوں اسی شکل میں دیکھوں گی۔ میری یاد میں انہیں بڑھاپا نہیں آیا۔ اور وہ ہمیشہ جوان ہی رہینگی۔"

احمد نے حیرت سے پوچھا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہاری بہن یہاں کہاں؟" انیس اس طرح اپنے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے کوئی نابینا دل کی آنکھوں سے کچھ ٹٹولتا ہے۔

دیر تک تصویر بہ تصویر کا منظر رہا۔ دونوں خاموش آنکھیں تک ساکت۔ احمد انیس کی پہیلی بوجھنے کی کوشش میں اور انیس اس فکر میں کیونکر اتا پتا دوں۔ یکایک انیس نے اپنی مٹھی میں سے ایک پن سا نکالا جس کی گھنڈی ہیرے کی تھی۔ احمد کا رنگ زرد پڑ گیا اور انیس مسکرائی۔ احمد جانتا تھا کہ اس خوبصورت پن میں موت چھپی ہوئی ہے اس نے انیس کی بہن والی پہیلی بوجھ لی۔ جھپٹ کر اس کا پن والا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ آنکھیں جھکا کر بولی "کیوں! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ میں تمہارے تصور میں ہمیشہ ایسی ہی جوان اور اسی طرح مسکراتی رہوں گی؟" احمد نے شرمسار لہجہ میں کہا "ابھی نہیں! تمہارے جاتے رہنے سے اب مجھے رنج ہوگا، تمہاری روح بھی شاید چین نہ پائے۔ پھر اگر ضرورت ہوئی، تو دونوں ایک ساتھ! سمجھیں" اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بڑی بڑی بوندیں ٹپکیں۔

اب احمد کی دوسری کیفیت تھی۔ انیس نے اسے ایک ایسا میخانہ جھنکایا تھا جس میں صرف الست کے مستوں ہی کو بار ملا کرتا ہے۔ ایک بیوی عصمت شعار ایماندار، گھر کو جنت، اور جنت میں اپنا گھر بنانا چاہتی ہے تو ایسے ہی شراب کے جام چلا کرتے ہیں۔ احمد نے انیس کی نسبت غلط رائے قائم نہیں کی تھی۔ محبت کے مقابلہ میں دور اندیشی انکار جذبات کا استعمال غلط سہی لیکن وہ ہر حال میں ثابت قدم رہی، اس کی شرافت اور وفاداری نے بالآخر احمد کے توہمات کو کھلی ہوئی شکست دیدی اور اسے ماننا پڑا کہ روح کی پاکیزگی، جسم کی خوبصورتی سے زیادہ اور زیادہ دیرپا ہے۔

رمضان کا مہینہ تھا کہ ایرانی واعظ بغداد میں آیا۔ ان دنوں میں مسلمان خدا و رسول کی باتیں زیادہ سنتے ہیں ہندوستان میں بھی حافظوں اور مولویوں کی کمائی کی

بہ فصل ہوتی ہے۔ مسجد جامع میں اس کا وعظ شروع ہوا۔ نئے مولوی کی عموماً زیادہ قدر ہوتی ہے۔ پھر ایرانی، پورالستانی، تین حج کئے ہوئے۔ تقدس کی ساری شانیں موجود، عمر بھی بزرگی کے دائرہ میں۔ دو ایک ہی وعظ کہے تھے کہ سارا شہر گرویدہ ہو گیا۔ عام و خاص سب کی زبان پر اس کا نام آنے لگا، جو کہتا یہی کہ معاد کے ہوں یا معاش کے قمر الزماں جیسے نکات آج تک کسی نے بیان نہیں کئے۔ احمد بھی شہرت سنکر اس کی محفل میں گیا۔ واقعی عام صوفیوں اور بازاری واعظوں کی نسبت اس کی تقریر کہیں دل نشیں اور فاضلانہ تھی۔ طوطے کی طرح رٹے ہوئے فقرے اور الفاظ نہ تھے بلکہ جس مسئلہ کو شروع کرتا ایسے نرالے ڈھنگ، اچھوتے پیرائے اور ایسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ کہ سامعین دنگ رہ جاتے۔

احمد کو اس ایرانی مقرر کا حسن بیان بہت پسند آیا اور اسے اپنے وقت کا سب سے بڑا عالم لدنی سمجھا۔ انیس سے بھی تعریف کی کہ ایک ایسا صاحب کمال واعظ آیا ہوا ہے جس کے تبحر علمی کی کوئی حد نہیں۔

انیس۔ واعظ سب ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔

احمد۔ نہیں، اس کا علم اور تحقیق عام واعظوں سے بہت بڑھی ہوئی ہے۔

انیس۔ آپ کے نزدیک وہ عالم ہے؟

احمد۔ ہاں عالم اور بے مثل عالم!

انیس۔ عالم ہے تو اسے حکیم، فلسفی اور الہیات کا معلم بھی ہونا چاہئے۔

احمد۔ ضرور ہوگا۔

انیس۔ پھر آپ اپنے شبہات کیوں نہیں مٹاتے۔ حسن کے بقا و فنا کے متعلق اس کے خیالات معلوم کیجئے۔ شاید وہ کوئی ایسی بات کہے جس سے ہمارے قلب کو سکون اور قوت حاصل ہو۔ کیونکہ اگر اس نے جو کچھ پڑھا ہے صرف واعظ بننے کے لئے نہیں، تو مشرقی اور مذہبی علوم کے علاوہ ارسطو اور افلاطون کی تصانیف اور اقوال سے بھی

وہ ضرور مستفید ہوا ہوگا۔

دل کو لگنے والی بات تھی احمد نے وعدہ کیا کہ کسی دن اسے دعوت کے بہانہ بلاکر بے شک اس کے سامنے یہ مسئلہ چھیڑنا چاہیے۔ طے یہ پایا کہ انیس بھی پردہ کے پیچھے بیٹھ کر دونوں کی باتیں سُنے گی۔ مولوی اور دعوت سے انکار؟ احمد کی درخواست فوراً منظور ہوئی اور وقت مقررہ پر مولانا قمرالزماں دو غلاموں کے ساتھ مع عبا و قبا، از بیش قیمت جواہرات سے مزین جو ہندوستانی، ایرانی او رمصری امیروں نے نذر کئے تھے تشریف لائے۔ اسباب زیب زینت اور دستار فضیلت کے سوا ویسے بھی آدمی مشتیں تھا۔ دراز قامت، سرخ و سفید، ٹھیٹ ایرانی خدوخال، ڈاڑھی بھورا سی کالی جو سینہ پر چھٹی تک نوک دار ہوتی چلی گئی تھی۔ اور پھر باتیں کرنے میں اعضا کی پھڑک کا تو کہنا ہی کیا۔

دسترخوان چنا گیا۔ بیسیوں قسم کے کھانے تھے۔ وعظ تو کہنا تھا نہیں کہ طبیعت کے بوجھل ہونے کا اندیشہ ہوتا۔ خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ کھانے سے فرصت پائی تو قمرالزماں نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر الحمد للہ کہا اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ انیس نے پردہ میں ایک باریک سا سوراخ پہلے ہی کر لیا تھا۔ بغیر صورت دیکھے باتیں سننے کا لطف نہیں آیا کرتا۔

احمد۔ جناب مولانا! کیا کبھی کوئی ایسی ہستی بھی عالم وجود میں آئی ہے، جس کو کامل طور پر قلبِ مطمئنہ میسر ہوا ہو۔

یعنی وہ فقیر سے امیر، یا امیر سے فقیر ہو جائے۔ اس کے گھر میں بوم بسے یا ہما رہے، موت کا لٹیرا اسے لوٹے یا حیات کا فرشتہ اس کی گودیاں بھرے۔ درد و دکھ ستائیں یا آرام و راحت میں کروٹیں لے، مگر کسی حالت میں بھی اس کے محسوسات میں فرق نہ آئے۔

قمرالزماں (بے تامل) یہ کمال انسانیت اور عبدیت کا درجہ ہے، جس کا مکمل نمونہ فخرِ موجودات نبی امی ہمارے ہادی اور پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

احمد۔ اس ذات مقدس کا کیا ذکر، ان کی ہستی تو جمال و کمال کا آئینہ، سراپا نور، بشریت اور الوہیت کے درمیان ایک برزخ تھی۔

اُدھر اللہ سے واصل اِدھر بندوں میں بھی شامل
خواص اس برزخ کبریٰ میں تھا حرف مشدد کا

پیغمبروں کو چھوڑ کر عام انسانوں میں ایسا کوئی بتائیے جو اپنے نفس کی خواہشوں کا بندہ نہ رہا ہو۔

قمرالزماں۔ ہندوستان میں دریائے گنگا کے کنارے برہنہ سادھو، آسن جمائے، بھبوت رمائے، پانی کی لہروں پر نظر جمائے اپنے دھیان میں ایسے بے حس و حرکت بیٹھے رہتے ہیں جیسے مٹی کا تھوا۔ خاک شورپیش زماں کہ خاک شوری کا بالکل نمونہ۔ آندھیاں آئیں، مینہ برسے انہیں خبر نہیں۔ خاک در خاک۔ آس پاس کی کوئی بیل بڑھ کر ان کے بدن سے لپٹ جاتی ہے اور وہ کسی سوکھے ہوئے درخت کا ٹھنڈ معلوم ہوتے ہیں۔ یاتریوں کا جب کبھی اُدھر سے گزر ہوتا ہے۔ اناج کی قسم سے تو کوئی چیز وہ کھاتے نہیں، پھل پھلاری ان کے حلق میں ڈال دیتے ہیں۔ یہی ان کی زندگی کا سہارا ہے۔ ان کی آنکھیں ایک جگہ ٹھہری کی ٹھہری رہ جاتی ہیں۔ اعضا شل اور زبان ساکت۔ بیس بیس تیس تیس بلکہ پچاس پچاس برس ایک حالت میں بیٹھے رہتے ہیں۔ مطمئن اور قانع۔ نہ ان کے پاس کچھ ہے، نہ کسی چیز کی انہیں آرزو۔ نہ وہ کچھ دیتے ہیں نہ انہیں کوئی احساس۔

احمد۔ (حیرت سے) اور ان کا مذہب؟

قمرالزماں۔ مرن گیان دھیان، اپنی ہستی کو مٹا دینا ہی ان کا مذہب ہے۔

احمد۔ تو کیا یہ فقیر نیک اور پرہیز گار ہیں؟

قمرالزماں۔ ہندوستان کے اصلی باشندے مظاہر پرست ہیں۔ ہمیشہ بہنے والے دریا۔ سدا بہار درخت۔ اونچے اونچے پہاڑ، ہر چیز کی ان کے ہاں پرستش ہوتی ہے۔

چونکہ ان سادھوؤں کی زندگی بھی عجائبات سے ہے اس لیے اس ملک میں ان کا شمار نیکوں میں ہوتا ہے اور انہیں خدا رسیدہ سمجھتے ہیں۔

احمد نے اپنے شاندار ایوان پر نظر ڈالی جس کے وسط میں ایک پھول دار پردہ پڑا ہوا تھا اور اس کے دوسری طرف انیس جلیس بیٹھی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے بیش قیمت سامان سے مکان آراستہ تھا۔ احمد کی پشت پر دریچے کھلے ہوئے تھے۔ باغ کی ہریاول آنکھوں کو طراوت بخش رہی تھی۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے دماغ معطر ہو رہا تھا۔

احمد۔ مگر اے ہادی! ہندوستان کے یہ پارسا، ہمارے مذہبی پیشواؤں سے کتنے مختلف ہیں۔ رہبانیت اور تکلیف مالا یطاق جس کی ہم کو ممانعت ہے، وہ اسے عبادت جانتے ہیں۔ انہوں نے وہ سارے رشتے ہی توڑ ڈالے جو عبدیت کی نمائش کے لئے معبود نے قائم کئے ہیں۔ بے ہمہ او۔ با ہمہ زندگی، دست بکار و دل بیار کی اہمیت ہی کو بھلا دیا۔ عجیب۔ اچھا آپ یہ تو فرمائیے کہ آپ کو کبھی مجھ جیسے کسی دنیا دار سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جو قناعت کی زندگی گزار رہا ہو؟

قمرالزماں۔ نہیں! دنیا میں رہتے بستے کے بعد ایک آدمی کا کلی طور پر قانع ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ جس قدر زندگی کے سامان زیادہ فراہم ہوتے جاتے ہیں اسی قدر ہوس بڑھتی جاتی ہے۔ تمناؤں اور خواہشات کی جگہ کبھی خالی نہیں رہتی۔ دو اگر نکلیں تو چار اور آگئیں۔ اور آخر وہ امور محالات کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ دولتمندوں اور عام انسانوں میں ہمیشہ میں نے یہی باتیں دیکھی ہیں۔ ان کے دلوں میں موجودہ اور حاصل شدہ اشیا کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ وہ اتنے خودکام اور حقیقت سے ناآشنا ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے ظرف کا اندازہ بھی نہیں رہتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا باوجود صدہا بہار در آغوش ہونے کے ان کی نظروں میں خزاں دکھائی دیتی ہے اور وہ اپنے نعمت کدے کے اندر سونے چاندی کے درختوں کی چھاؤں میں خیالی افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

ایرانی واعظ کی اس تقریر نے احمد کو ایسا قائل کیا کہ وہ اپنے دل کا اصلی بھید کہنے کیلئے تیار ہو گیا۔ کس پیرایہ میں کہے؟ یہ ذرا سوچنے کی بات تھی۔ لیکن قصہ طویل اور فرصت کم! پھر بنانے کا موقع ملے نہ ملے۔ اور اس وقت مولانا کا بھی بہرہ کھلا ہوا تھا۔ تمہید کے بغیر ہی کہنا شروع کیا۔

احمد۔ قبلہ و کعبہ! میری بیوی نہایت حسین، ظاہر و باطن، اور ہمہ صفت موصوف ہے۔ ایسی صورت میں مجھے اس سے محبت بھی بے اندازہ ہونی چاہئے۔ چنانچہ مجھ کو اس کے ساتھ محبت ہے۔ اتنی زیادہ کہ جب میں اپنی جان، اپنی آبرو اور اپنے دھن دولت کا اس کی ذات سے مقابلہ کرتا ہوں تو سب ہیچ نظر آتا ہے۔ گویا میری ساری دنیا بھی اس کا مول نہیں۔ لیکن اس کی یہی خوبصورتی، اس کے شباب کا یہی کمال میری روحانی لذتوں کے زوال کا سبب بھی ہے۔

قمر الزماں۔ اجتماع نقیضین!

احمد۔ جی ہاں! اس خیال نے میری زندگی حرام کر دی ہے کہ اس کے چہرہ کی کندن جیسی چمک ایک دن ماند پڑ جائے گی۔ اس کی جوانی کا نکھار بڑھاپے کے ہاتھوں بے روپ ہو جائے گا۔ اگر ایسا کوئی شخص جو موجودہ حالت پر قانع اور کسی مزید اضافہ کا متمنی نہ ہو اب تک آپ کی نظروں سے نہیں گزرا تو مجھے دیکھ لیجئے۔ کل کیا ہو گا؟ یہ تصور میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ مستقبل میں ہونے والے تغیرات میرے حال کے عیش و آرام کو قبل از وقت منغص کر رہے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ میری خوش نصیبی بد بختی سے ایک محال شئے کی طالب ہے کیونکہ ممکنات تو سب حاصل ہو چکے اور محض ایک تخیلی چیز میں نے خود اپنے آزار کے لئے پیدا کر لی ہے اس لئے کہ مجھے کوئی آزار نہ تھا۔ لیکن جناب عالی! یہ بات نہیں کہ میں اپنا دشمن ہوں۔ محبت کی ستم ظریفیاں اگر آپ مانتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ محبت کا سوال ہے جس کا جواب میں نہیں دے سکتا، جو روز بروز

بڑھتی جاتی ہے اور اب اس کی جتنی طاقت ہے میری ہمت ہار چکی ہے۔

قمرالزماں۔ ماشاءاللہ جو مجھ کو تمہاری بات میں کوئی کلام ہو۔ یہ تحفظِ حسن وجوانی کے خیال کو بے حقیقت سمجھوں۔ حُسن ایک نعمت ہے اور زوالِ نعمت کا تردد انسان کا فطری جذبہ ہے تمہارا تخیل بیجا نہیں۔ لیکن بات اتنی ہے کہ اگر ہم میں کوئی طاقت ایسی ہوتی جو زوال اور فنا کو روک سکتی اور پھر ہم نہ رکتے تو ہم خطاوار تھے۔ جب ہم قانونِ قدرت سے مقابلہ کی قوت نہیں رکھتے اور قانونِ الٰہی کی رو سے اس عالمِ فانی کی ہر چیز فانی ٹھیری تو چار و ناچار عروج و زوال کی سیر دیکھنی ہی پڑے گی۔ یعنی ہم کو بے چون چرا اُن امور کو برداشت کرنے کیلئے بالکل تیار رہنا چاہئے جو ناقابلِ مدافعت ہیں۔ ہم کو کسی حال میں بھی نہ موت سے مفر ہے نہ اُن نقصانات سے جو انسانی قسمت کا نوشتہ ہیں۔ تاہم میں کوشش کروں گا کہ تمہارا یہ فکر دور ہو جائے۔ اس لئے کہ تمہارے خیالات معصوم ہیں۔ اللہ تبارک وتعالےٰ میری مدد کرے۔

دل شکستہ کو باتوں کی ڈھارس بھی بہت ہوتی ہے۔ احمد تو یہ سن کر نہال ہو گیا ملا قمرالزماں کے کبھی قدم لیتا کبھی ہاتھ چومتا اور ایسا معتقد ہوا کہ ایک سونے کی جڑاؤ زنجیر جیب سے نکال اس کے گلے میں ڈال دی۔ پھر بیتابی سے کہنے لگا "پھر دیر کیا ہے فرمائیے، میں ہمہ تن گوش ہوں" یہ کہتے کہتے اس کی نگاہ اس پردہ پر پڑی جس کے پیچھے انیس بیٹھی تھی اور پردہ کے سوراخ میں سے اس کی سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔

قمرالزماں۔ (سن کر) عورت کی تخلیق قدرت کا ایک راز ہے۔ اس کے انکشاف کا یہ موقع نہیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ اماں حوا بابا آدم کا ذوقِ موانست پورا کرنے کیلئے پیدا کی گئی تھیں۔ چنانچہ ابتدائے آفرینش سے یہ آج تک مرد کی فطرتِ جنسی کا لازمہ رہی ہے اس کے حسن وجمال سے لطف اندوز ہونے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو حواسِ خمسہ کے ذریعہ، نگاہوں سے اس کی آنکھوں کی شراب پیئے۔ ہاتھ اس کے باغِ جوانی کی خوشہ چینی

کریں۔ کانوں سے نغماتِ جوانی سُنئے، شامہ کو اس کی خوشبو سے بسائے۔ بوسوں سے ذائقہ کی حِس کو شاد کام کرے۔ اس کے حُسن کی بہار ایسی نوازش کرے جیسے مشرقی ہوا پودوں کے ساتھ کرتی ہے۔ اسے آغوش میں لیں۔ گدگدائیں اور اس کے حُسن سے غسل کریں۔ لیکن یہ خوشی عارضی سمجھو، ادھر حُسن پر زوال آیا۔ جوانی ڈھلی اُدھر مرد کے جذبات میں پہلا سا جوش نہیں رہتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت سب طرح سے گرم ہے اور مرد کے احساس سرد اس میں محظوظ ہونے کی قدرت نہیں۔ جاننا چاہئے کہ ہر شخص میں حواس سے متکیف ہونے کے لئے قدرت نے جداگانہ طاقتیں رکھی ہیں۔ اپنی معینہ حد سے وہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پھر آپ کو ایک اور چیز پر غور کرنا ہے یعنی ایک عورت خوبصورتی میں آپ کے حواس پر چھارہی ہے اور آپ اسے اتنا ہی چاہتے ہیں جتنا افسانوی عاشق اپنے معشوق کو، تاہم لطف اندوزی کے دوران میں کچھ ایسے وقفے بھی آپ پائیں گے جنہیں ایک فانی انسان کی کمزوریوں کی طرح آپ کو محسوس کرنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ ایک مدہوش محبت اور غیر مطمئن شخص ان وقفوں کی پروا نہ کرے۔ اور اس غمگین حقیقت کو جانتے ہوئے کہ حسن و جوانی چندروزہ ہے، چاند جو آج چڑھ رہا ہے۔ کل ضرور اتریگا۔ اس کا ہلال سے بدر ہونا ہی۔ بدر سے سلخ ہونے کی دلیل ہے۔ کسی کمزوری کو خیال میں نہ لائے اور حریصوں کی طرح برابر اس کے ساغرِ حُسن سے اپنی پیاس بجھانے کی آرزو کئے جائے۔

مولانا نے اتنا کہہ کر ذرا دم لیا۔ اس تقریر سے بعض نکتے احمد پر واضح ہوگئے۔ اس کے سوال کے ایک حصہ کا جواب مل گیا۔ لیکن پوری تشفی نہیں ہوئی۔ بیان کس قدر مبہم تھا۔ اکثر جملوں کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر بھی اس نے آمنّا صدقنا کے سوا کچھ نہ کہا۔ قمرالزماں کی بشرہ شناسی مشہور تھی وہ سمجھ گیا کہ ابھی اور وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ پیارے میزبان! اس میں شک نہیں کہ تم اپنی انتہائی

مصروفیت اور مکروہات دنیا میں مبتلا ہونے کے بعد بھی اپنی بیوی کی محبت سے غافل نہیں ہوتے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ ایسی حالتوں میں جب وہ تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو یا پاس ہونے کے باوجود تم جسمانی طور پر کوئی حظ نہ اٹھا سکو۔ اس وقت بھلا اس کی محبت کہاں رہتی ہے؟

احمد۔ دل کی گہرائیوں کے اندر لذتوں کی یاد یا اس کا قرب حاصل کرنے کی امید میں۔

قمر الزماں۔ بس؟

احمد۔ اس کے علاوہ اور تو کچھ میں جانتا نہیں۔

قمر الزماں۔ اس قدر بے خبری؛ عزیز من؛ تمہاری یاد اور تمہاری امید میں تخئیل کو بڑا دخل ہے۔

احمد۔ تخئیل کا اضافہ کئے بغیر کیا میرا جواب مکمل نہیں ہوتا۔

قمر الزماں۔ ہرگز نہیں، دنیا میں تخئیل ہی کے سارے کرشمے ہیں۔ یہ ایک غیر مادی سائنس ہے اور حسن کا عکس، رحمتوں اور زحمتوں کا بانی، اگر اس کے سایہ میں شادمانیاں پرورش پا رہی ہیں تو اس کی برکت جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے۔ نہ وہ قرب و بُعد کا مقید ہے نہ اسے کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے۔ یہ حُسن مصور جب ایک مرتبہ روح پر اپنا تصرف جما لیتا ہے تو پھر موت کے سوا کوئی مادی طاقت اسے جدا نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کا حصر صرف مرد کی جسمانی طاقت پر نہیں ہے بلکہ وہ سایہ کی طرح ڈھلتی ہوئی عورت بھی اس کی ذمہ دار ہے جس کے جمال و کمال کا وہ عکس ہے۔ واہب العطایا کے اس تحفہ کی مانند جو صنفی جذبات سے ملوث نہیں ہوتا۔ اسے ایک آئینہ سمجھو کبھی کدورت سے آلودہ نہ ہونے والا۔ دراصل حسن میں صرف الوہیت ناقابلِ زوال ہے۔ اس لئے کسی کی خوبصورتی میں اسی کو دیکھو جو غیر فانی ہے اور جسے وقت یا بد قسمتی تم سے نہیں چھین سکتی۔"

جوہری کو فلسفیانہ ساخت کے ان لڑی بند موتیوں کی اتنی پرکھ نہ تھی جتنی جواہرات کی۔

وہ خاموش رہا۔ اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کی تقریر اچھی طرح اس کے ذہن نشین نہیں ہوئی اور اگر کچھ سمجھا ہے تو شک و شبہ کے ساتھ۔

قمرالزماں۔ (اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے) یہ تو ایک عورت کے حُسن سے تمتع حاصل کرنے کی پہلی صورت ہوئی۔ اب دوسرا طریق سنئے۔ ظاہر ہے کہ سب انسان یکساں نہیں۔ کیا بلحاظ دولت و ثروت اور کیا بلحاظ ذہنیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جس طرح جوہری کے مقابلہ میں ایک پتھر پھوڑ جواہرات کی قدر و قیمت نہیں جانتا۔ اسی طرح قدرتی بات ہے کہ ایک کہار یا تربوز بیچنے والا حُسن کی نزاکتوں کو کیا سمجھے گا۔ ایسے لوگ صرف جسمانی طور پر ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں ان کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ لیکن جن کے نزدیک عورت صرف نفس کی پیاس بجھانے کو نہیں پیدا کی گئی ان کا نظریہ کچھ اور ہے۔ لہٰذا عورت سے صرف زن و شو کے تعلقات ہی میں لذت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اسے قدرت کا شاہکار سمجھ کر بھی محظوظ ہونا ممکن ہے۔ ڈر ہے کہ ایک دوسری بحث نہ چھڑ جائے ورنہ میں کہتا کہ احسن الخالقین کے اسی حُسن کی بدولت تصویر کشی اور بت پرستی شروع ہوئی۔ دیکھ لو ایک مسلم کے سوا ساری دنیا، اپنے چاہیتوں، اپنے چاہنے والوں کی تصویریں بنواتے، بت ترشواتے ہیں۔ ایک تصویر برسوں اور ایک سنگ مرمر کا بُت صدیوں رہتا ہے۔ گویا حُسن پر زوال نہیں آتا بلکہ تصور کے علاوہ عالم وجود میں بھی ایک چیز دکھائی دیتی ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور خدا نے اپنے رسول عربی کی امت کو بُت بنانے کی ممانعت کی ہے اس لئے ہمیں اور بھی زیادہ ضرورت ہے کہ عورت میں حُسن الٰہی کے جلوے اور صنعت خالق کو دیکھیں تاکہ ظہور جمال کو تفنن سے جدا کر سکیں اور حُسن کی نیستی کو احسن تقویم کے آئینہ میں دیکھیں۔ صفات سے ذات کا پتہ لگانے کے یہی معنی ہیں۔

تقریر کیا رنگ برنگ کے پھولوں کا گلدستہ تھی، کوئی فقرہ تصوف میں تو کوئی معلمانہ۔ ستھرے الفاظ منجھے ہوئے جملے پھر انداز بیان نہایت شاندار، قمرالزماں اپنے دل میں خوش تھا کہ جادو جیسا چاہئے تھا چل رہا ہے۔ واقعی اس کی باتیں عمر بھر کی کمائی تھیں اور ساری معلومات کا نچوڑ۔ بار بار خود بخود جھومنے لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اپنی عذب اللسانی پر اس کا دل چٹخارے لے رہا ہے

احمد کو بہت ستو جہ دیکھ کر اس نے یہ بھی یقین کر لیا کہ جوہری کے سوال کا جواب حسب دلخواہ دیا گیا اور خدا نے ایسی مدد کی کہ صداقت لباس بھی نظر فریب پہنے رہی۔ اتنے میں جھٹپٹا ہونے لگا۔ قریب کے منارے سے موذن نے مغرب کی اذان دینی شروع کی۔ ایرانی پردیسی ملا صاحب بڑا کیا اٹھ کھڑا ہوا اور بے پروائی سے بغیر صاحب خانہ کی رخصت کے چلنے کیلئے مڑا کچھ احمد ہی کے ساتھ اور اسی وقت حضرت علامہ نے یہ استغنا اور اذان کا احترام نہیں دکھایا۔ بلکہ قمر الزماں نے مدتوں کی مشق کے بعد یہ عادت بہم پہنچائی تھی کہ اپنی تعریف سے خوش ہو کان سنیں مگر آنکھیں تعریف کرنے والے کو نہ دیکھیں اور اپنی تقریر ایسی جگہ ختم کریں کہ لوگ تشنہ رہ جائیں اس وتیرے سے ملا صاحب کو کیا کیا فائدے تھے۔ تفصیل تو رہ جائیں ہمارے نزدیک ایک سب سے بڑا فائدہ تو یہ تھا کہ لوگوں کو تنقید و تبصرہ کا موقع ہی نہ ملتا اور اس کے بعد اعتراضات تو سامعین کے ذہن سے اتر جاتے فقط شاندار الفاظ ہی الفاظ کانوں میں گونجتے رہتے۔

اس وقت اذان سے بہتر موقع اور کیا ملتا۔ احمد کی تشفی خدا کے دربار میں حاضری سے تو زیادہ بہتر چل نکلا۔ احمد ایسا سناٹے میں آیا ہوا تھا کہ کوئی بات نہ کر سکا۔ مولانا ابھی دروازے تک ہی پہنچے ہوں گے کہ وہ یکایک چونکا۔ سونے کی ایک منقش قاب لیکر دوڑا۔ قبلہ و کعبہ کے ایک غلام کو آواز دیکر بلایا۔ قاب اس کے حوالے کی اور کہا کہ حضرت کی خدمت میں یہ میرا ناچیز تحفہ پیش کر دینا۔

ختم مہمان رخصت ہو گیا تو احمد نے نماز پڑھی۔ مصلے سے اٹھ کر پردے کو ایک طرف کیا۔ انیس کو دیکھا کہ دریچہ میں منہ لٹکائے کھڑی ہے۔ چہرہ اترا ہوا۔ کچھ کھسیانی کھسیانی۔ خدا خیر کرے! احمد اس کی طرف بڑھا اور پیشانی چوم کر کیفیت حال پوچھی یا انیس ابھی چاہتی تھی کہ انیس تلخی سے غیر معمولی لہجہ میں ترش ہو کر بولی "اس ایرانی کو اب گھر میں گھسنے نہ دینا۔ محمود کے بیٹے احمد! سن لیا؟"

احمد نے تعجب سے پوچھا۔ تو کیا تمہارے خیال میں جو کچھ اس نے کہا وہ ٹھیک نہیں؟

انیس (آنکھوں میں آنسو بھر کر) وہ مجھے تم سے چھڑانا چاہتا ہے!

احمد (تسلی دیتے ہوئے) واللہ! تم بھی کیسی غلط رائے قائم کرنے والی ہو۔ بھلا یہ بھی

کوئی بات ہوئی۔

انیس۔(بھرائی ہوئی آواز میں) کیا کوئی شخص اپنی محبوبہ کو ایک بے جان مورت کی طرح دیکھ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایک مسلمان اور پتھر کے بت کی پوجا؟ صریح کفر! وہ ہم دونوں کے درمیان کوئی جادو کی پڑیا ڈالنا چاہتا ہے' کالے جادو کی۔ اس کا ساحر ہونا میں پہچان گئی۔ جہانتک میرا خیال ہے وہ جادوگر' اس کا باپ جادوگر ورنہ اس کے ٹھگ ہونے میں تو شک ہی نہیں۔

احمد نے دیکھا کہ قمر الزماں پڑوس کی مسجد سے نکل کر اپنے غلاموں کے ساتھ اس کھڑکی کے نیچے گزر رہا ہے جہاں یہ دونوں کھڑے تھے۔ اس نے اس خیال سے کہ کہیں انیس کی آواز اس کے کانوں میں نہ پڑ جائے اور جس مہمان کی ابھی اتنی قدر و منزلت کی ہے' چند منٹ کے اندر اندر بیوی کے ہاتھوں اس کی تذلیل ہو۔ مناسب سمجھا کہ یہاں سے ہٹ جائے۔ وہ انیس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے آیا جہاں قمر الزماں کو بٹھایا تھا۔

احمد (نرمی سے) شاید تم نے مولانا کے الفاظ اور مطلب اچھی طرح سمجھا نہیں۔ پھر مہمان کی دلجوئی کا حکم تو خدا نے دیا ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ اس کا مقصد ہماری محبت میں رخنہ ڈالنا نہیں۔ آخر ایک سرسبز و شاداب چمن میں بس بونے سے اس کو کیا نفع؟

اس کا منشا تو یہ تھا کہ ہماری محبت دائم و قائم رہے۔ اور زمانے کی دست برد سے بچکر فنون لطیفہ کے غیر فانی درجہ پر پہنچ جائے ایک بہترین ہیرا کسی زیور میں جڑا ہوا۔ ایک نفیس قالین گل بوٹوں سے مزین اور ایک خوشنما محل اپنی وضع میں نرالا' مرصع کاری' بافت اور ساخت کے لحاظ سے فنون لطیفہ کے شاہکار نہیں ہیں بلکہ یہ سچ سمجھو کہ ان سب مصنوعات سے بڑھ کر عورت ہے اور سارے انسانی کمال کے نمونے اور یہ صنعت الہٰی کا شاہکار۔ تم ہی بتاؤ اگر میں تمہیں غیر مسلموں کے زاویہ نگاہ سے مرمریں بتوں کی طرح دیکھوں تو ہماری محبت میں کیا کوئی فرق آئے گا؟

یہ بات سن کر انیس یا تو رو رہی تھی یا قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ گانے والی کنیزوں کو پکارا

اور ناچنے گانے کا حکم دیا۔ دم بھر میں اندر کا اکھاڑا جم گیا۔ ناچنے والیوں نے اپنی زلفیں کھول کھول کر پریوں کی طرح رقص شروع کر دیا۔ کوئی تنبورہ بجا رہی تھی، کوئی بربط اور کوئی بانسری، فضا میں موسیقی کی تانیں لہرا رہی تھیں۔ انیس نے بھی کچھ دیر تنبورہ اپنے سر پر رکھ کر بجایا۔ دو چار گتیں بھریں اور احمد کو دیکھ کر ایک خاص ادا سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ سارا ایوان اور ایوان کی ہر چیز متبسم ہے۔

ناچتے ناچتے، تانیں اڑاتے اڑاتے جب وہ دم لینے کو ذرا ٹھہرتی تو احمد کو مخاطب کر کے کہتی "اچھا تو میں تمہاری محبت کا بُت، اور صنعت صانع کا شاہکار ہوں" اور پھر اپنا کام شروع کر دیتی۔ احمد نے ہزاروں مرتبہ اسے ناچتے گاتے دیکھا تھا، وہ اس فن میں واقعی طاق تھی۔ لیکن آج تو اس کے ڈھنگ ہی انوکھے تھے۔ بجلی کی طرح کوند رہی تھی۔ کبھی زمین کو ٹھکراتی۔ کبھی ہوا کو چکراتی، کبھی چھپ جاتی، کبھی نکل آتی۔ ہر بار لجاجت، تمکنت۔ اداسی اور خوشی کے نئے نئے انداز دکھاتی۔ آخر احمد سے صبر نہ ہو سکا، وہ اسے پکڑنے کھڑا ہوا۔ ہاتھ بڑھا کر چلا۔ بجلی کو کوئی آغوش میں لے سکتا ہے؟ جب یہ قریب پہنچا انیس چک کر ادھر سے اُدھر ہو جاتی اور ہنس کر کہتی۔ میں ایک بُت ہوں، مرمریں! ہمارے درمیان آرٹ ہے۔ کیوں؟ کیا تمہیں قالین بافی کے کسی شاہکار کی ضرورت ہے؟ خبردار! مجھ کو ہاتھ نہ لگانا۔ اچھا کیا تم ایک محل کو اپنی آغوش میں لے سکتے ہو؟

اسی طرح کے بیسیوں فقرے وہ کہتی اور چکر لگاتی رہتی، قمر الزماں کی ہنسی اڑاتی تھی یا اپنے شوہر کو چڑاتا؟ یہاں تک کہ احمد تھک کر فرش پر گر پڑا۔ انیس نے تنبورہ رکھ دیا، رقص و سرود موقوف، محفل برخاست۔ گانے بجانے والیاں چلی گئیں۔ احمد کو سہارا دے کر اٹھایا۔ گھور کر دیکھا۔ منہ بنایا، مسکرائی اور سنجیدگی سے کہا "میں سنگیں مجسمہ نہیں ہوں" اس کی آنکھوں کی تھکنا نہ چمک، بردبار چہرہ، نرم گرم لب و لہجہ مگر ساتھ معشوقانہ انداز۔ احمد مجبور تھا کہ اپنی غلط فہمی کا اعتراف کرے۔ اور اسے یہ اقرار کرتے بنا: "تم کو بُت بنانے والا بیوقوف ہے" تم تو جلتی

پھرتی، بولتی چالتی، کودتی اچھلتی، جیتی جاگتی میری انیس ہو" بات آئی گئی ہوئی۔ رات گئے اِدھر اُدھر کا ذکر کرتے کرتے انیس نے پھر ایرانی کا ساز چھیڑ دیا اور اس کی تقریر کو بے سُری بتا کر کہنے لگی "غلط ہے کہ آدمی پتھر کی مورتی سے انسان کی طرح متمتع ہو سکتا ہو۔ یہی عقیدہ تو بت پرستی کی بنیاد ہے۔ تم نے نہیں سوچا خدا نے عورت میں تکمیل جمال کیا اس لئے کی ہے کہ بت پرست کی طرح مرد اس کی ڈنڈوت کرے اور خوش ہو جائے۔ ایسی بیکار شئے کی تخلیق سے آخر کیا نتیجہ؟ کاش انسان کا پہلا جوڑا جنت سے اسی طرح کی لطف اندوزی سیکھ کر آتا۔ احمد۔ وہ لمبی ڈاڑھی والا ملاّ، اگر کوئی برا الزام اس پر نہ رکھو کیونکہ ہمارے نبی نے کسی پر تہمت لگانے سے ہمیں روکا ہے تو وہ نہایت چلتا پرزہ ہے۔ اپنی رنگ بازی سے اس نے تم پر پورا اثر ڈالا۔ ورنہ میں تو سمجھتی ہوں کہ اس کی ساری تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اسے خود اپنے کلام پر یقین نہیں۔

عورت ذات جب کسی کے پیچھے پڑ جائے تو قبر کھودے بغیر نہیں چھوڑتی۔ پھر عورت بھی دولتمند، پڑھی لکھی، حسین، لوخیز، معشوق قسم کی۔ انیس نے جناب مولانا کے وعظ کی ایسی قلعی کھولی کہ احمد کو جواب نہ بنا اور اس کے دل میں قمرالزماں کی باتیں کچھ کچھ مصنوعی سی معلوم ہونے لگیں۔ تاہم اس نے جلدی نہیں کی۔ وہ برابر ایرانی کے حق بجانب ہونے میں کچھ نہ کچھ کہے گیا بالآخر انیس انگڑائی لے کر بولی "اچھا تو اس کی آزمائش ہی کیوں نہ کر لی جائے"۔

احمد۔ چونک کر کس بات کی؟

انیس۔ یہی کہ جو کچھ اس نے کہا ہے دل سے کہا ہے یا زبان سے۔

احمد۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟

انیس۔ میں بتاؤں۔ اسے ایک مرتبہ یہاں پھر بلاؤ۔ اور ایک خوبصورت لڑکی کا ناچ دکھاؤ۔ تم کو معلوم ہو جائے گا وہ کتنے پانی میں ہے اور آرٹ اور حیات ابدی میں کیا فرق ہے۔

یہ وقت بڑا نازک تھا۔ عقل اور محبت میں رسہ کشی شروع ہو گئی تھی۔ دونوں خاموش

ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

انیس۔ کیوں؟ کیا یہ تدبیر اس کے قول و فعل کو جانچنے کی نہیں؟

احمد۔ میں اسے بلا لاؤں گا۔ مگر کسی دوسری رقاصہ کے بدلے تم خود کیوں نہ اس کے سامنے رقص کرو تاکہ تم کو بالمشافہ اس کی آزمائش کا موقع ملے۔ وہ کیا جانے گا کہ تم میری بیوی ہو۔

ایک شوہر کی اپنی عفیفہ بیوی سے ایسی بیہودہ فرمائش نہ صرف خلاف شرع بلکہ نہایت شرمناک بھی تھی۔ انیس کے دل میں احمد کی اس ناقابل فہم تجویز نے ایک ہیجان سا پیدا کر دیا۔ لیکن احمد نے اسے مہلت نہ دی کہ وہ کچھ کہے یا اس بات کو محض مذاق سمجھے۔ جلدی سے بول اٹھا کہ "ہمارے تعلقات میں انشاء اللہ تعالیٰ کوئی فرق نہیں آئے گا۔ محبت ایسی شے نہیں جو کسی حرکت سے بدل جائے۔" اور اس نے یقین دلایا کہ "یہ قربانی جو تم کو عجیب معلوم ہوتی ہے۔ عجب نہیں ہماری محبت کے رشتوں کو زیادہ مضبوط کر دے۔

انیس۔ لیکن مذہبی رسم و رواج کا احترام کیا تمہارے دل میں نہیں ہے؟

احمد۔ اس وقت مجھے کافر محبت سمجھو۔ مذہب کو بھی دیکھ لیں گے۔ اب تو جو میں کہوں وہ کرو اور تنگ نظری کو جانے دو۔ تمہارا حسن اسی طرح مذہب و ملت سے آزاد ہے جس طرح ہماری محبت مقابلہ و مقاسمہ سے بے نیاز۔ اسی لئے زندگی کے جن تجربوں میں ہم حصہ لے رہے ہیں انہیں بھی تقابل و توازن سے بالاتر سمجھنا چاہئے۔ تم تو اس لطف کا تصور کرو کہ جب تم اس زبان دراز واعظ پر اپنے حسن کا جادو چلاؤ گی اور وہ یہ اقرار کرنے کیلئے مجبور ہوگا کہ جو کچھ اس نے کہا محض کذب و فریب اور صرف زبان کی شعبدہ بازی تھی۔

انیس۔ اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا؟

احمد۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اسے اپنے قول میں سچا ماننا پڑے گا اور پھر اس تمثیل سے جو اس نے بیان کی ہے ہم اس سے اپنی مطلوبہ ابدیت کی آرزو پوری کر لیں گے جسے ہم نے صحرا میں فضول تلاش کیا تھا۔ آئندہ اللہ کی مرضی۔ بہر حال ہماری نیت بری نہیں

ورنہ تم بھی جانتی ہو کہ اکثر اعمال کا نتیجہ نیتوں پر ہے ؎

چوتھا باب

ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ ایرانی واعظ قمرالزماں ایک مرتبہ پھر محمود کے بیٹے، مدینہ بغداد کے سربرآوردہ جوہری احمد کی محلسرا میں دکھائی دیا۔ وہی ایوان، وہی ایک طرف پہلے کی طرح پردہ پڑا ہوا۔ مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ فانوس اور شمعدان روشن تھے۔ دسترخوان بچھایا گیا۔ دعوت میں پچھلی دفعہ سے زیادہ تکلف تھا۔ میزبان اور مہمان آلتی پالتی مار کر بیٹھے۔ مزے لے لیکر نہایت اطمینان کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر احمد نے محراب دار منقش چھت کی طرف دیکھا جسے خوبصورت اور نازک ستون سروں پر اٹھائے ہوئے تھے اور مولانا سے خطاب کر کے کہا "یا شیخ! بقائے دوام اور خلقتِ حسن کے متعلق گزشتہ صحبت میں جناب نے جن خیالات اور انکشافات کا اظہار فرمایا تھا۔ اس ناچیز نے ان پر غور کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپ نے فلسفہ و حکمت کے دریا بہا دئے۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ میری نگاہوں میں انمول موتی تھے لیکن کیا عرض کروں۔ مجھے اپنے عجز کا اقرار ہے کہ میں ان سے حقیقی فائدہ اٹھانے سے قاصر رہا کیا آپ براہِ بندہ نوازی اس سلسلہ میں ایک اور سوال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائینگے؟

قمرالزماں۔ میرے معزز مہربان! آپ آزاد ہیں۔ بے تکلف پوچھیں۔

احمد (کسی قدر تامل کے بعد) گستاخی نہ ہو تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کسی جمیل صورت سے جو آپ کے روبرو اور آپ کے تصرف میں آنے کے لئے تیار ہو صرف فنی نقطۂ نظر سے محض حسن کے تخیل میں لذت اندوز ہو سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی

روح کی گہرائیوں میں سے خواہشات نفسانی کو بالکل نکال دیں اور وہ خالی جگہ فقط حُسن کے تخیل سے رسی بسی رہے؟

قمرالزماں۔ میرے لئے یہ ناممکن نہیں! میں ایسا کرنے پر قادر ہوں۔ بلکہ ایک میں کیا ہر وہ شخص جس کو ایک بار بھی حظ نفسانی کے مقابلہ میں حُسنِ ازل کی برتری کا احساس ہوگیا اس کے لئے یہ کچھ مشکل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مادّی جذبات کے محدود امکانات میں قید رکھے۔ وہ آدمی ہی کیا جو حقیقت آشنا ہونے کے بعد بھی مجاز کے تالاب میں غوطے کھاتا رہے۔

احمد۔ جلّ جلالہ۔

قمرالزماں۔ (لاپرواہی سے) اور کچھ ارشاد؟

احمد۔ (نیچی نظر کرکے) میں نے ایک کنیز خریدی ہے۔ صورت میں پری۔ سیرت میں حور اور نزاکت میں شاخِ گل۔ نہایت شوخ، بے حد صاحب کمال بے مثل ناچتی اور گاتی ہے۔

قمرالزماں۔ بہت مبارک۔

احمد۔ اگر جناب پسند فرمائیں تو اسے بلاؤں؟ حُسنِ دلکش کی تصویر ہے۔ اس کا ناچ دیکھئے گا نہ سنئے اور عملی طور پر بتائیے کہ تصویر میں کس طرح زندہ حُسن کے مزے لئے جاتے ہیں۔

اتنا کہتے ہی احمد نے لونڈیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے تنبورے سنبھال۔ ہم آہنگی کیساتھ بلند تانی گت بجانی شروع کی۔ مدہم سروں میں شیریں نغمے ابھی پرورش ہی پا رہے تھے کہ یک بیک ایوان کا زمبانی پردہ ہٹا اور حُسن کا شعلہ نکل کر سامنے آگیا۔

حُسن کی یہ رقصاں تصویر، آسمان سے زمین پر اترتی ہوئی بجلی یا انیس اس وقت عجب توبہ شکن اور زاہد فریب روپ میں تھی۔ کولھوں سے فرش تک زرد باریک ریشمی پشواز جس کے کناروں پر زردوزی کام۔ جھالر میں بڑے بڑے موتی ٹکے ہوئے۔ اوپر کا حصہ کسی عجیب کپڑے کی محرمت نما بنا ہوا۔ بازوؤں پر جڑاؤ بازو بند۔ پاؤں میں مینا کار جھانجن۔ ہاتھ کی انگلیوں میں پور پور ہیرے یاقوت نیلم اور زمرد کے انگوٹھی چھلے۔ سب سے بڑھ کر زربفت کی دو پٹیاں

حُسنِ خداداد کو چار چاند لگا رہی تھیں۔ جن میں سے ایک بائیں ران میں بندھی ہوئی تھی اور دوسری نے اسکی پیشانی کو حلقہ میں لے رکھا تھا۔ جس کے نیچے بڑی بڑی نشیلی آنکھیں جادوگری کر رہی تھیں مختصر یہ کہ دعوتِ نظر کا پورا سامان تھا۔

انیس نے آتے ہی سازوں کے تاروں پر رقص شروع کر دیا۔ جلت پھرت سے خون کا دور تیز ہوا۔ رخساروں پر سُرخی دوڑنے لگی مگر سینے کے چڑھاؤ اُتار سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ وہ اس وقت ایک بے پناہ حُسن کی مالک بنی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس کا جوشِ رقص عصمت فروش نہیں، تھوڑی دیر میں یہ ہنگامی نشہ اترتے ہی مائل بہ سکون ہو جائے گا۔ وہ ایک دائرے کے اندر پنجوں کے بل ناچ رہی تھی۔ سارے جسم کا بوجھ پیروں کی انگلیوں پر تھا۔ اس لیے ٹانگوں کی ہر رگ گوری کھال میں سے پھڑکتی دکھائی دیتی تھی۔ رقص ہندوستانی وضع کا تھا، اس کے ہاتھ اور بازو برابر حرکت کر رہے تھے۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں دور خوابوں کی دنیا کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ حُسن اور اس پر نئے نئے انداز۔ ناچ کیا ایک قیامت تھا دورانِ رقص میں جب وہ پشواز کے دائیں بائیں دونوں سرے پکڑ کر اور ایک ادا کے ساتھ انہیں پھیلاتی ہوئی دونوں ہاتھوں کو سر کے اوپر لے جاتی۔ ایک ٹانگ پیچھے کی طرف پھیلاتی اور دوسری پر نصف کھڑی ہو کر تیتری، بنتی یا مور کا ناچ دکھانے کے لئے ہاتھوں کو تھرتھراتی اِدھر اُدھر جھومتی اور آگے پیچھے جھکتی تو دلوں کا تو کیا پوچھنا، ساکت و جامد در و دیوار میں بھی ایک تڑپ سی محسوس ہونے لگتی۔

خدا خدا کر کے یہ جادو کا تماشہ ختم ہوا مگر انیس جلیس نے اپنا آج کا رقص معمول کے مطابق اپنے شوہر کے قدموں پر سر جھکا کر ختم نہیں کیا بلکہ ایک لمحہ ادائے خاص کے ساتھ دونوں ہاتھوں کو سر کے اوپر طائے کھڑی ہوئی اور پھر یکایک پردے میں روپوش ہو گئی۔ احمد کی حالت نہ پوچھو۔ مہمان کا لحاظ تھا۔ کلیجہ پکڑے بیٹھا رہا۔ قمر الزماں کے حواس بھی اپنے ٹھکانے پر نہیں رہے تھے۔ بے چینی ظاہر تھی۔ کئی پہلو بدلتے ہوئے وہ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور دھیمی

آواز سے متاثر لہجہ میں کہنے لگا۔ اے خوش نصیب نوجوان! جو میں نے ابھی دیکھا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی نسبت کچھ کہوں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کی کنیز دوبارہ صورت دکھائے گی یا اس ہندی رقص پر اس نے اپنے کمال کو خاتمہ کر دیا؟

احمد۔ نہیں، وہ ایک مرتبہ اور رقص کرے گی۔

قمر الزماں (اتنی دھیمی آواز سے کہ بمشکل احمد کے کانوں تک پہنچ سکی) تو مجھے اپنی رائے کو محفوظ رکھنا چاہیے۔

قمر الزماں اس قدر سٹپٹایا ہوا سا تھا کہ اس نے اپنے تاثرات چھپانے کی غرض سے اپنی شخصیت کی بھی پروا نہ کی اور ساتھ رکھی ہوا نبیذ کا پیالہ اٹھا کر بے تکلف منہ سے لگا لیا۔ تلچھٹ تک نہ چھوڑی۔ اور پھر تکیہ سے لگ کر بیٹھ گیا۔ میزبان اور مہمان دونوں خاموش اور کسی نئے منظر کے منتظر تھے کہ باغ کی طرف سے کھڑکی کے راستہ ایک عجیب سریلی صدا آئی ؎

کچھ سوز تھا مطربوں کی لے میں   کچھ آگ بھری ہوئی تھی نے میں

آواز دلوں کو برما رہی تھی کہ اتنے میں پردہ حائل اٹھا اور انیس دوبارہ باہر آئی۔ اب کے حسن نے سادگی میں جلوہ دیا۔ سارے زیور اتار دیے گئے تھے! سفید لباس برہنگی کا پردہ دار تھا کھڑکی میں سے آنے والی آواز قریب آنے لگی اور اس کی گت پر ناچ شروع ہوا۔ ایک نور تھا کہ فضا میں رقصاں تھا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں خواب زلیخا دیکھ رہی تھیں۔ یوسف کی جمالی شان تعبیر میں مصروف تھی۔ قمر الزماں کے باطن کو کون ٹٹولتا؟ احمد اپنے ہوش میں نہیں رہا انیس کی نسائی رعنائی نے اس کا دل کیف و مسرت سے معمور کر دیا۔

یہ سماں زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ نسوانی شرم نے پاؤں پکڑ لیے۔ موسیقی بند ہو گئی۔ انیس کچھ کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی۔ یکایک وہ چونکی! ایک جھرجھری لی اور بے تحاشا بھاگ کر پردہ میں جا چھپی۔ احمد کچھ دیر تو ٹکٹکی باندھے اس جگہ کو دیکھتا رہا جہاں وہ شمع حسن فانوسی لباس میں کھڑی ہوئی تھی۔ پھر ایک گہرا ٹھنڈا سانس لے کر اپنے مہمان پر نظر ڈالی۔ قمر الزماں آنکھیں جھکائے

کسی البتہ گہرے غوطہ میں تھا کہ نہ پورے ڈاڑھی سے کھیل رہے تھے نہ ہونٹوں پہ کوئی حرکت تھی۔ مجلس کا سکوت توڑنے، تصور کے جمود کو حرکت میں لانے اور خیال کی سردی میں گرمی پیدا کرنے کا خوش مست نبیذ کا ایک جام پیش کیا مگر احمد نے ہاتھ کے اشارہ سے انکار کرتے ہوئے کہا اس کی حلت وحرمت یا کراہت کے فقہی مسائل سے مجھے اس وقت بحث نہیں تاہم میں معافی چاہتا ہوں۔ شکریہ! دماغ اس عارضی سرور سے پاک رہے تو بہتر ہے۔

احمد اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ قمر الزماں کا پردہ تقدس چاک کرنا چاہتا تھا انسان کی فطرت ہے خصوصاً جب مزاج بھی رنگین ہو کہ جو جس کی صحبت میں آئے اسی جیسا ہو جائے ایک حمام میں نہانے کی آرزو اور ننگے ہونے سے انکار؟ اس نے تالی بجائی، ایک غلام اندر آیا بڑے کے چھوٹے کمرہ کو کھولنے کا حکم دیا۔ کمرہ کھلا، دونوں مہمان اور میزبان وہاں سے اٹھے جہاں حسن عریاں کی پرچھائیاں ابھی تک نگاہوں میں رقص کر رہی تھیں۔

جب دونوں اس چھوٹے آراستہ کمرہ میں آکر بیٹھ گئے اور ماحول بدلا تو قمر الزماں نے مسکراتی ہوئی آنکھیں کھول کر کہا۔ اچھا تو ہمیں پہلے اس حسین وجمیل کنیز کی جنسی خلقت پر تنقید کرنی چاہیے پھر اس کے اکتسابی کمالات سے بحث کریں گے۔ جہاں تک حسن اور دلکشی کا تعلق ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ وہ ایک بڑی حد تک نظر فریب ہے۔ گو قدرت کسی کے ساتھ بخل نہیں کرتی لیکن اصلی جمال کی شان تو کچھ اسی کو زیبا ہے۔ خیر مجھے اندیشہ ہے کہ آپ پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑے اس تبصرہ کو چھوڑتا ہوں۔ اب رہا اس کا رقص جس پر غالباً آپ نے بہت کچھ خرچ کیا ہوگا۔ اور اس پر خود بھی نازاں ہے۔ آپ کی نگاہ میں کیسا ہی حسن کو نکھار کرنے والا سہی۔ ایک نقاد کے لیے فن کی حیثیت میں کوئی چیز نہیں۔ کمال کے درجہ تک پہنچنے میں بہت کسر ہے۔ رقص کے متعلق بعض ایسی بنیادی باتیں جاننے کے قابل ہیں جن سے ہر رقاصہ کو واقف ہونا چاہیے۔ آپ کی کنیز بالکل اناڑی ناچنے والیوں کا سا ناچ ناچتی ہے۔ ہندوستانی ناچ میں اس کی ساری خامیاں ظاہر ہو گئیں۔ جوشیلے اور محبت کے متوالے

نوجوان! میرے اس تبصرہ سے کبیدہ خاطر نہ ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں آپ کی فیاضانہ دعوت کی جس سے میرے حواس خمسہ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی تضحیک کر رہا ہوں یا کم از کم شکر گزاری کا مادہ مجھ میں نہیں۔ بلکہ میری دلی خواہش یہ ہے کہ جس تنقیدی نظر سے میں لطف اندوز ہوا ہوں آپ بھی اسے سمجھ لیں۔ ہر کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کیلئے طریقہ اور سلیقہ بڑا ضروری ہے اصول کے بغیر فروع دیر تک آنکھوں کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ وہ مغرور لونڈی ان باتوں سے بے خبر ہے۔ ہندوستانی رقص کے وقت اس کے کپڑے بے جوڑ تھے۔

احمد (ایرانی کی بات کاٹتے ہوئے پیشانی پر بل ڈال کر) بجلی چمکنے اور کوندنے کے لئے کسی سلیقہ یا ترتیب کی محتاج نہیں۔ حُسن کو جلوہ گری سے کام ہوتا ہے۔ آپ نے اس کی ساحرانہ اداؤں پر توجہ نہیں کی؟

ایرانی۔ جلد بازی نہ کیجئے۔ اس کی شکل و شمائل، حرکات و سکنات پر بھی روشنی ڈالونگا پہلے اس کے دوسرے ناچ کا تو حال سُن لیجئے۔

احمد۔ (ذرا تیز لہجہ میں) کیا اس میں بھی آپ کو خامیاں نظر آئی ہیں؟

ایرانی۔ (متانت سے) ہاں رقص کو اگر ایک تفریحی کھیل نہ سمجھا جائے تو وہ کسی ایک ملک کا مخصوص ناچ نہ تھا۔ گت کہیں کی توڑ کہیں کا۔ ہاتھوں کی حرکت ایشیائی تھی تو پیروں کی جنبش افریقی . . . .

عاشق کہیں معشوق کی تعریض گوارا کر سکتا ہے۔ احمد انیس کی اس طرح کی ہتک کب گوارا کرتا۔ اس کے تلووں سے جو لگی تو دماغ تک پہنچی۔ سہرک اٹھا اور طیش میں آکر بولا "بس جناب خاموش رہیے۔ معلوم شد بافندگی۔ میں ایسی بکواس پسند نہیں کرتا۔ خدا جانے وہ کونسی منحوس گھڑی تھی کہ آپ سے ملاقات ہوئی (زیادہ جوش میں آکر) کلب ابن کلب! ریش دراز خبیث! کوئی ایسا ہی سرد جذبات کا خواجہ سرا ہوگا جو ایسے سرمدی نظارے کے بعد تیری جیسی یاوہ گوئی

کرے۔ دُور ہو۔ اِس گھر سے نکل جا اور بھولے سے بھی یاد نہ کر کہ احمد جوہری نے تجھے دعوت دی تھی۔ یہ کہتے ہوئے احمد نے کمرہ کے ایک طرف کا پردہ ہٹایا اور ایک تنگ چور راستہ سے قمرالزماں کو باہر دھکیلتے ہوئے کہا "خدا کبھی تمہاری صورت نہ دکھائے مع اپنی ڈاڑھی کے تشریف لیجاؤ" قمرالزماں اپنا جبہ و دستار سنبھالتا ہوا خاموش سر جھکائے روانہ ہوا۔ اور اس طرح انیس جلیس کی پہلی نمائش ختم ہوئی +

پانچواں باب

جذباتی آدمی ہمیشہ زود رنج اور ساتھ ہی ذی حس بھی ہوتا ہے۔ اس کا غصہ دودھ کا سا ابال سمجھو۔ گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولہ۔ بہوت قمرالزماں کے ساتھ جوشِ جوش میں خلافِ تہذیب برتاؤ کرنے کو تو کر گیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب مزاج کی تیزی کم ہوئی تو اسے بہت افسوس ہوا۔ وہ اپنی اس غیر شریفانہ حرکت پر اپنے اوپر دیر تک ملامت کرتا رہا۔ بلکہ دنوں تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ اس واقعہ کی یاد آئی اور اس کا سر ندامت سے جھک گیا۔ ہر چند کوشش کرتا کہ ایرانی سے اپنا سلوک بھول جائے اور کہتا کہ آخر مجھے ہو کیا گیا تھا۔ یہ لازمی نہیں کہ جو چیز میری نظر میں بے عیب ہے دوسروں کی آنکھیں بھی اسے بے داغ دیکھیں۔ اگر کوئی شخص لیلیٰ را بچشمِ مجنوں باید دید کا قائل نہیں تو کیا اسے مار ڈالنا چاہیے۔ اپنی رائے کے اظہار میں سب آزاد ہیں۔ بُرا ماننے کی کیا بات تھی۔ میں نے پوچھا تو اس نے کہا۔ اس بیچارے کا کیا قصور اور کوئی قصور سمجھا بھی جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اس نے موزوں یا نہ صاف گوئی سے کام لیا، میری دلشکنی کا خیال نہ کیا، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ مذاقِ سلیم نہیں رکھتا۔ لیکن پچھتاوا نہ جاتا۔ ایک چیٹک تھی کہ برابر لگی ہوئی تھی۔

اس اثنا میں احمد نے کئی مرتبہ چاہا کہ ایرانی کا پتہ لگا کر اس کے پاس جائے۔ اور اپنی بیہودگی کا اعتراف کر کے اپنے دل پر سے ایک بوجھ ہٹائے مگر انہیں نے روک روک دیا۔ قمرالزماں کی بیباکی اور صاف گوئی کے ساتھ ساتھ احمد اکثر اس حقیقت کی تلاش میں پریشان رہا کرتا کہ آخر

یہ کیا بات ہے کہ وہ میری طرح انیس کے حسن اور اس کی نمائشوں پر ایمان کیوں نہ لایا۔ اُسے نظر آئیں تو صرف اس کی کوتاہیاں؟ یہی دھن بندھی ہوئی تھی کہ ایک رات وہ اچانک سوتے سوتے چونک پڑا! اس کے کان میں آواز آئی کہ "جمالی کی ساری شامیں عیش میں کہاں! تیری آفت میں مبتلا ہے"۔ یہ سننا تھا کہ وہ چیخ مار کر کھڑا ہو گیا۔ چاند نکلا ہوا تھا چاندنی دریچہ میں سے کمرہ کے اندر آ رہی تھی اور احمد شب خوابی کے کپڑے پہنے ہکا بکا کھڑا تھا۔ بدن میں سنسنی، دل کی حرکت تیز، دماغ پریشان۔ آخر اس نے سرہانے سے طلائی کنجی اٹھائی اور ننگے سر ننگے پاؤں حرم کا رخ کیا۔ حرم کے دروازہ کے سامنے ایک دیوہیکل حبشی چوکیداری کی غرض سے لیٹا ہوا تھا۔ کھٹکا پا کر اٹھ بیٹھا اور اپنے آقا کو پہچان کر غنودگی کے عالم میں دعائیں دینے لگا۔

سونے کی کنجی سے احمد نے چاندی کا قفل کھولا اور انیس کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ ایک ہلکے آبی رنگ کا فانوس روشن تھا۔ انیس کی پیاری بلی جو قالین پر پڑی خرخر کر رہی تھی اٹھ کر سایہ میں بھاگی۔ مسہری پر نیلے ریشم کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ موتیوں کی جھالر جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ احمد نے پردہ ہٹا کر جو دیکھا کہ اس کی بیوی، جان کی مالک، ایمان کی محافظ، حسن کی ملکہ سو رہی ہے مگر؎

ہے چشمِ نیم باز عجب خوابِ ناز ہے　　فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

احمد پر اس وقت خوف و ہراس اور مایوسی ملی ہوئی ایک کیفیت طاری تھی۔ اس کے ہوش کب بجا تھے کہ اس منظر سے لطف اٹھاتا۔ آگے بڑھ کر اسے جگانا چاہا۔ شانے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ شوہر پر نظر پڑی، سراسیمہ، منہ پر ہوائیاں، کلیجہ دھک سے ہو گیا کہ کیا افتاد پیش آئی۔ پوچھنا چاہا، زبان نہ کھلی۔ اتنے میں احمد اس کے پاس بیٹھ گیا اور ایک گہرا سانس لے کر کہنے لگا "ایک فرشتے نے، دوزخ کے فرشتے نے میری جنت کو تباہ کرنے کے لیے ایک آتشیں گولا مارا ہے"۔ انیس کچھ سمجھی نہیں۔ اس نے احمد کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر حیرت سے پوچھا "کیا تم نے کوئی برا خواب دیکھا ہے؟ میں نے بارہا کہا ہے کہ زیادہ

نیند نہ پیا کرو۔

احمد۔ (کانپتی ہوئی آواز میں) نہیں، یہ بات نہیں۔ میں نے ایک غیب کی آواز یہ کہتے سُنی ہے کہ "انیس جلیس خوبصورت نہیں۔"

انیس سمجھ گئی کہ احمد کے ماؤف دماغ نے کوئی نیا پلٹا کھایا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی میرے آقا! آپ کے دشمنوں کو توہمات نے گھیر لیا ہے۔ آپ اپنے کانوں کو بند کر لیں۔ میں بہت خوبصورت ہوں۔ کیا آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اطمینان نہیں کر سکتے؟

یہ کہہ کر انیس نے کچھ ایسی ادا سے احمد کو دیکھا کہ وہ تاب نہ لا سکا۔ اپنا منہ تکیوں کے نیچے چھپا لیا اور انیس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں حائل ہو گئے۔

باب سویلا کے قریب کارواں سرائے اور جعفر بازار تھا۔ احمد کے ایک بچپن کے یار عبیداللہ کے نام اس بازار کی چودھراہٹ تھی۔ دونوں ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے۔ کوئی بیس برس کا ذکر احمد نے انجیر کے درخت سے گر کر اپنا ٹخنہ توڑ دیا تھا۔ عبیداللہ صبح سے شام تک اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ طرح طرح کی باتوں سے دل بہلاتا اور اچھے ہونے کی دعائیں مانگا کرتا۔ پورے دو مہینے یونہی گزار دئیے۔ سچی محبت اور پکی دوستی کہیں تھکا کرتی ہے، اس کے بعد دونوں جوان ہوئے، احمد عیاشی میں پڑ گیا۔ عبیداللہ نے شادی کر لی۔ پہلی سی آزادیاں نہ رہیں۔ میل جول کم ہوتے ہوتے اتفاقیہ ملاقاتیں رہ گئیں۔ ملے خوش ہو گئے۔ نہ ملے تو کچھ مٹا بی نہیں۔ دلوں میں برابر ویسے ہی مخلصانہ تعلقات تھے اور دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہی شریفانہ برتاؤ اور وہی بے کدورت محبت تھی۔

جب آدمی پریشان ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں اپنے بھروسہ کے دوستوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ دوست کی یہی پہچان ہے کہ بُرے وقت میں یاد آئے۔ احمد کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے اور بے لاگ مشورہ لینے کی نیت سے عبیداللہ کی تلاش تھی۔ اتفاق کی بات ایک دن بازار میں

دونوں کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ مسنون صاحب سلامت اور مزاج پرسی کے بعد احمد نے چھوٹتے ہی عبیداللہ سے تخلیہ میں کچھ بات چیت کرنے کی خواہش کی۔ اسے اپنے پرانے سدابہار دوست کی یہ خزاں رسیدہ حالت، زرد رنگت، پچکے ہوئے بے رونق رخسار، خشک ہونٹ دیکھ کر احمد کو سخت رنج ہوا اور دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ جلدی سے ایک تخلیہ کی جگہ لے گیا۔ کھانے پینے کا کچھ سامان لایا کہ شاید کسی اچانک مصیبت نے بھوک، پیاس کی آزمائش میں ڈال دیا ہو۔ مگر احمد نے انکار کر دیا اور کہا "ان تکلفات کو رہنے دو۔ تم تو وہ باتیں سنو جو میری روحانی خوشیوں کی بیری ہیں"

عبیداللہ۔ خدا شیطان کے شر سے بچائے، اور وہ کیا ہیں؟

احمد۔ تم نے سن لیا ہوگا۔ کئی سال ہوا میں نے شادی کر لی ہے۔

عبیداللہ۔ ہاں مجھے معلوم ہے۔ جب سے تم نے بوڑھے حسیب کی بیٹی سے اپنا گھر آباد کیا۔ غریب کی بستی سنسان ہوگئی۔ لیکن اے احمد ابن محمود! میں تمہیں غمگین اور مشوش دیکھتا ہوں؟

احمد۔ میں خوش نہیں۔

عبیداللہ۔ حسیب کی بیٹی انیس کی طرف سے یا کوئی اور سبب ہے؟ صورت اس کی غالباً وجہ شکایت نہ ہوگی؟

احمد۔ اس میں شک نہیں کہ انیس حسن وجمال کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ مجھے اس کی خوبصورتی پر اتنا ہی یقین تھا جتنا خدا اور اس کے رسول پر ......

عبیداللہ۔ تھا کیا معنی؟

احمد۔ اب میں اس کی خوبصورتی کے بارے میں کچھ مشتبہ ہوگیا ہوں۔

عبیداللہ۔ (ہمدردی کے لہجہ میں) تو کیا کسی بیماری یا حادثہ نے اس میں کوئی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

احمد۔ نہیں۔ نہ وہ بیمار ہوئی نہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا۔ رنگ روپ، خدوخال جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس کی کسی چیز میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ آسمانِ حسن پر اسی پرواز کے ساتھ اڑ رہی ہے۔ مگر میں نے ذرا ذرا شک کرنا شروع کر دیا ہے۔

عبیداللہ۔ یہ آپ جو اس میں رہ کر باتیں کر رہے ہو۔؟

احمد۔ ہاں بالکل! سنو تو۔ اور جو دیکھ میں اس میں کوئی عیب نہیں پاتا۔ طرح طرح سے جانچتا ہوں اور وہ بے نقص حسن مجسم دکھائی دیتی ہے تاہم کچھ ایسا معاملہ ہے کہ مجھے اپنی آنکھوں پر بھی اعتبار نہیں ہوتا۔ شاید میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں!

عبیداللہ۔ اس ہیر پھیر کی باتوں سے کیا فائدہ؟ ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے۔ تم اپنی جان کو مصیبت اور جھگڑے میں کیوں ڈالو؟ اس سے نیت بھر گئی ہے تو دوسری کر لو۔ نہ تمہارے پاس روپے پیسے نام نمود کی کمی نہ بندر میں حسین لڑکیوں کا قحط۔

احمد۔ دوست! تم میرے لفظوں سے میرا دلی مطلب نہیں سمجھے اور اس لئے تمہارا یہ مشورہ غیر منصفانہ ہے۔ کیا تم اس نتیجہ پر پہنچے کہ انیس کی محبت میرے دل میں سرد ہو گئی؟

عبیداللہ۔ محبوب کے حسن پر جب چنیں چناں ہونے لگے تو محبت کی شان کہاں رہی؟

احمد۔ جہاں تک محبت کا تعلق ہے، مجھے انیس سے اب بھی اسی قدر محبت ہے جتنی پہلے روز تھی، بھلا جو شخص اپنی منکوحہ کو معشوقہ سمجھے اور اس پر جان دے، ہو سکتا ہے کہ وہ اس پر دوسری عورت لائے۔ میرا مقصد محبت کے رشتوں کو منقطع کرنا تو نہیں۔

عبیداللہ۔ پھر جناب کا مقصد کیا ہے؟

احمد۔ میرا مطلب یہ ہے کہ حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔

عبیداللہ۔ یعنی۔

احمد۔ یعنی کسی صورت سے میں یہ معلوم کر سکوں کہ اس کی محبت نے مجھے اندھا بنا دیا ہے اور وہ صرف میری نگاہوں ہی میں حسین ہے یا جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں فی الواقع ویسی ہی

وہ اپنے حسن میں یکتا ہے۔

عبید اللہ۔ یہ تو عزیز اپنے ہوش کی دوا کرو۔ اچھے مخمصے میں پھنسے۔ ادھر دیکھو اگر تم کو اس سے محبت ہے تو کیا غم ہے۔ چین کرو مزے اڑاؤ۔ دن عید اور رات شب برات مناؤ۔ مرد بھی اتنا نہیں سمجھتے کہ عورت کا حسین ہونا شوہر کی آنکھوں میں اس کی انتہائی خوش نصیبی ہے۔ دوسروں کی نگاہوں میں وہ خوبصورت ہو نہ ہو۔ تمہارے سوا اسے کسی اور سے واسطہ ہی کیا؟

احمد۔ اچھی چیز صرف دیکھنے ہی کے لئے ہوتی ہے دکھانے کے لئے نہیں؟

عبید اللہ۔ عورت کو بھی کوئی بکری کا مال سمجھا ہے۔ آخر دوسرے جنہیں واسطہ نہیں اسے کیوں دیکھیں۔ اسلام میں پردے کا حکم تمہارے نزدیک کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ میں تو اسی لئے عورت کے برقعہ کو ہزاروں بلاؤں کی سپر سمجھتا ہوں۔ برقعہ اس صنفِ ضعیف کا قلعہ ہے۔

احمد۔ تم سمجھتے ہی نہیں۔

عبید اللہ۔ یا اللہ۔ آپ تو سمجھاؤ۔

احمد۔ مجھے اس سے محبت ہے اور نہایت شدید۔

عبید اللہ۔ بہت اچھی مبارک ہو۔

احمد۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ میری آنکھیں میرا تمسخر اڑائیں۔

عبید اللہ۔ بس؟

احمد۔ یہ کچھ کم صدمہ کی بات ہے؟

عبید اللہ۔ تو جناب میرے پاس آپ کے اس مالیخولیا کا علاج نہیں۔

احمد۔ کیا کہا؟ تم مجھے کوئی مشورہ نہیں دوگے؟

عبید اللہ۔ ناسمجھ بچوں کو کہیں مشورہ دیا جاسکتا ہے۔ احمد یاد رکھو۔ پریشانیاں،

مشکلات اور شبہات یا تو اپنا حل آپ پیدا کر لیتی ہیں یا ان میں سے ایک ایک منفعت طلبی پہاڑ کی طرح تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔

احمد۔ عبداللہ! نصیحت کو چھوڑ دو۔ تم میرے دوست ہو اور دوست کا کام دوست کی مدد ہے۔ دوستی کا حق ادا کرو۔ مجھے تم سے زیادہ کسی پر بھروسہ نہیں۔

عبداللہ۔ سب سے بڑا دوست اللہ ہے! اچھا کہو مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

احمد۔ ذرا میرے گھر چلو۔ میری بیوی بے نقاب ہو کر تمہیں اپنا رقص دکھائے گی۔ تم اسے دیکھنا اور پھر بتانا کہ کیا وہ درحقیقت ایسی ہی خوبصورت ہے جیسی میں اسے سمجھتا ہوں یا کچھ اور۔؟

عبداللہ۔ (تیوری چڑھا کر) خدا تم کو راہِ راست پر لائے۔ احمد اب تک تو مجھے تمہاری محبت میں شبہ تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا دین و ایمان بھی خطرے میں ہے۔ دوستی تو دوستی میں کسی اور قیمت پر بھی اپنے کو آزمائش میں ڈالنے کے لئے آمادہ نہیں۔ مہربانی فرما کر دوبارہ مجھ سے ایسی بیہودہ خواہش نہ کرنا۔

احمد۔ آخر اس میں تمہارا کیا نقصان ہے۔ سرودِ ہمسایہ اور حسنِ رہگزر ے میں تو کوئی شرعی ممانعت بھی نہیں۔

عبداللہ۔ اللہ کے بندے تم نے تو بے حیائی پر کمر باندھ لی ہے۔ مجھے کیوں گنہگار کرتے ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو سوچو، اگر میری نیت خراب ہو گئی، بندہ بشر ہے۔ حسن کو دیکھ کر بڑے بڑوں کے ایمان خراب ہو گئے ہیں، تو پھر اس کی خوبصورتی تمہارے کس کام کی؟ خدا کو مان کر اس لغو خیال کو اپنے دل سے نکال ڈالو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری بیوی حد درجہ کی حسین ہے۔ میرے کہنے کا یقین کرو اور ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر سدھارو۔

ہر چند احمد نے عبداللہ کو بہلایا پھسلایا، لڑکپن کی محبت جتائی، دوستی کا واسطہ دیا، دولت کے سبز باغ دکھائے مگر وہ ایک پکے خیال کا مسلمان، مذہب کا سچا پیرو،

پسیجا تک نہیں۔ خدا اور رسول اور شرافت کے خلاف ایک قدم اٹھانے پر آمادہ نہ ہوا۔ یہی کہتا رہا کبھی نرمی اور کبھی ترش روئی سے کہ اگر دنیا کے تمام لالچ بھی جمع ہو جائیں جب بھی میں تمہاری اس خواہش کو ٹھکرا دوں۔ تمہاری یہ درخواست نہ صرف اسلامی رسم و رواج اور شرع محمدی کے خلاف ہے بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ اس کا نتیجہ ہم دونوں کے لئے بھی مضر ہو سکتا ہے۔ بے دلیل نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر میں نے تمہاری بیوی کو دیکھ کر اس کے ازحد حسین ہونے کا فتویٰ دے دیا تو بہت ممکن ہے تمہیں کسی وقت یہ بدگمانی پیدا ہو جائے کہ میری نیت صاف نہیں۔ میں بھی اس کو جنسی جذبہ کے تحت دیکھتا ہوں۔ اور اگر اس کی خوبصورتی نے مجھے متاثر نہیں کیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے خلاف میرے چند الفاظ تمہاری شادمانیوں کو غارت کر دیں اور اس متاع بے بہا کے نقصان کا باعث بنیں اور میری طرف سے تمہارے دل میں ایک نہ مٹنے والی نفرت گھر کر کے دوستی کو دشمنی سے بدل دے۔ لہٰذا میرا فرض ہے کہ تمہیں مجبور کر دوں اور ایسے بے نتیجہ کام سے روکوں جس کا آغاز دیوانگی اور انجام جہنم ہے۔ دوستی کے معنی یہ نہیں کہ دوست گناہوں میں بھی دوست کا ساتھ دے دوست کو اگر کوئی برائیوں سے نہیں بچا سکتا تو دوستی کے وقار اور اس کی شرافت کو تو داغدار نہ کرے۔ اسی طرح یہ بات بھی نہ بھولنی چاہئے کہ دوست سے کبھی ایسا کام نہ لیا جائے جس سے دوستی میں فرق آئے۔" ایک آدمی اور ایک دوست پر اثر ڈالنے والی جتنی چیزیں ہوتی ہیں وہ سب حد سے
سب عبیداللہ کے سامنے پیش کر چکا اور عبیداللہ میں جنبش تک نہ آئی تو وہ شدت بے بسی میں۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح   کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

"بہت اچھا عبیداللہ آج سے ہماری دوستی ختم!" کہتا ہوا سید با اٹھا اور خدا حافظ کہے بغیر چل دیا۔

بازار اپنی پوری گہما گہمی پر تھا۔ دوکانیں آراستہ، ہر قسم کا مال سجا ہوا، ہر جگہ آدمیوں کے ٹھٹھ، دیسی پردیسی ہر طرح کے لباس پہنے ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ امیر سے غریب تک سب اپنی دھن میں تیز تیز دوڑ رہے تھے کہیں گذر ہو رہی تھی کہیں ان کی پرکھ۔ تاہل کبھی

اس کے پیچھے دوڑتے کبھی اُس کے آگے! کب کسی کی خریداری ختم ہو تو اُن کی مزدوری کا وارا آئے۔ کہیں بھیڑ بھاڑ میں سے بچو بچو کی آوازیں لگاتے ہوئے پکھالیے پانی سے بھری ہوئی پکھالیں گدھوں پر لادے چلے جاتے تھے۔ اونٹ گاڑیاں اپنے اڈوں پر موصل اور بصرے جانے والے مسافروں کو بٹھانے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ ایک طرف کسی امیر کا باورچی سفید براق کپڑے پہنے غلاموں کے ہاتھوں میں ٹوکریاں، زنبیلیں، کھانے پینے کا سامان لینے جا رہا ہے تو دوسری طرف خچر پر نقاب ڈالے آگے پیچھے خواجہ سرا کوئی خاتون چلی جا رہی ہے۔ خچر خوب سجا ہوا ہے۔ ایک حبشی کے بائیں ہاتھ میں خچر کی لگام اور دائیں میں چابک ہے۔ جہاں چلتے چلتے وہ دھیما پڑا یا کھوروالا یا اس نے چابک رسید کیا۔

احمد انسانوں کے اس طوفانی سمندر میں اپنے دوست عبید اللہ کی بے مروتی کا ماتم کرتا بغیر کچھ دیکھے راستے چلا جا رہا تھا۔ گویا اس ساری ہل چل میں اس کے لئے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ راستہ میں ایک جنازہ بھی اسے ملا۔ ایک مسلمان کو ضروری ہے کہ مسلمان کی میت کو کندھا دے مگر احمد کی نظر اس پر بھی نہ پڑی یا برابر سے نکل چلا گیا اور جتنی جلدی ہو سکا اپنے گھر پہنچا۔ گھر آیا تو سانس پھولی ہوئی تھی کبھی اس کمرہ میں کبھی اس دالان میں وہ اپنی بیوی کی تلاش میں تھا۔ انیس اپنے کمرے کی کھڑکی کے پردہ میں خاموش کھڑی تھی۔ دیکھتے ہی کہنے لگی۔

انیس۔ بیٹھو بھلا۔

احمد۔ بات سُنو!

انیس۔ معاف کیجئے! کیا آج دن کو کوئی خواب دیکھا؟ (اور اپنے شوہر کو بہلانے کے لئے مسکرانے لگتی ہے)

احمد۔ (اپنی بیوی کے مسکرانے اور اس کی بات پر خیال نہ کرکے) اے میری انیس جیسی! مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنے خواب سے تمہیں پریشان کر دیا اور شرمندہ ہوں کہ تمہاری اچھی بھلی زندگی میرے گونا گوں توہمات کی بدولت بدمزہ ہو گئی ہے۔ یہ سب ہی خطا ایرانی کی ہے

تم نے پھر کہا۔ اس شیطان کو دور ہی رکھو، گھر میں نہ بلانا۔ اس نے تمہاری خوبصورتی کے آگے ہاتھ پھیلایا تھا۔ مگر اس میں ضرور کوئی خبیث روح حلول کئے ہوئے ہے۔ یاد رکھو اپنے پہلو میں دل کی جگہ پتھر رکھتا ہے ورنہ کب نقصان تم کر بیٹھتے اور ایسی خرافات کہے۔ خیر اب تو جو نقصان پہنچنا تھا پہنچ گیا وہ وقت تو پھر آ نہیں سکتا۔ لیکن بتاؤ کہاں؟ اس نے تمہارے حسن کی تحقیر کی۔ میرا بھی نام نہیں اگر اس کی تذلیل کئے بغیر دم لوں۔ اس کی نہ ہی حسن کے خیال کی سہی۔ اس معاملہ میں ہم دونوں کو متحد ہونا چاہیے۔

انیس (نرم اور نازک آواز سے) میرے اچھے شوہر، ضرور ہیں آپ کی خوشی کے لئے ایک جان اور دو قالب ہو کر ہم کو اس بھوت کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ آپ ناحق ایرانی کی یاوہ گوئیوں سے متاثر ہیں۔

جوہری بچہ کی طبیعت اپنے انداز میں نرالی ہی تھی۔ جو دل میں ٹھن گئی بس ٹھن گئی پھر صحیح اچھے برے سے کیا بحث۔ انیس اپنی جگہ رہی تھی۔ اور احمد کا دماغ اپنی ادھیڑبن میں مصروف تھا۔ دولت جس کے پاس ہو۔ اقبال سامنے ہو اس کا دماغ اگر اپنی جگہ سے ٹل جائے تو بڑی دور کی سوجھتی ہے۔ احمد نے سوچتے سوچتے ایک بات نکالی۔ اس کی بہکی ہوئی عقل نے کہا کہ بڑے آدمیوں سے کام نہیں چلے گا۔ کیوں نہ کسی چھوٹے درجہ کے کسی غریب شخص کو لا کر انیس کا رقص دکھائے۔ ان پڑھ سیدھا سادھا انسان اپنے دل کا بھید نہیں چھپایا کرتا۔ وہ بغیر بناوٹ کے جو بات ہوگی سچی سچی کہہ دے گا۔ ایک لمبی چوڑی تمہید کے بعد احمد نے اپنا یہ خیال انیس پر ظاہر کیا تو وہ چونک پڑی کہ یہی بات ہے میرا حسن کیا ہوا تماشہ ہو گیا۔ اس نے بہت سمجھایا کہ "ان خصوصیات میں پڑ کر کہیں رسوا ہوتے ہو۔ شیطان کے کان بہرے اور آنکھیں اندھی۔ کہیں خدانخواستہ کوئی نیا بکھیڑا نہ پڑ جائے" مگر احمد کے ذہن میں جو سما گئی سما گئی وہ اپنے ارادہ سے ٹلنے والا نہ تھا نمدی شوہر اور فرمانبردار بیوی آخر اسے اپنی خواہش کی تکمیل پر رضامند کر لیا اور وہ بیچاری صبر و شکر کر کے چپ ہو گئی۔

الغرض نعیم رضا اب احمد کے لئے کیا پس و پیش تھا۔ اس نے پچاس دینار رومال میں باندھے اور گھر سے نکل کھڑا ہوا کوئی بیس پچیس قدم ہی گیا ہو گا کہ ایک تربوز بیچنے والے پر نظر پڑی کہ گدھے پر تربوز لادے ایک دو منزلہ حویلی کے نیچے کھڑا اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اتنے میں دوسری منزل کی کھڑکی کھلی۔ رسّی میں بندھی ہوئی ٹوکری لٹکی۔ تربوز والے نے اس میں سے آدھا درم نکال لیا اور کئی تربوز اس میں ڈال دئے۔ ٹوکری اوپر کھینچ لی گئی۔ باقی تربوز لئے وہ آگے بڑھا۔ احمد بھی اس کے پیچھے چلا۔ آدھ گھنٹے تک وہ آگے آگے اور یہ پیچھے۔ احمد اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ہمت نہیں پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ سارے تربوز بک گئے اور وہ تھکن ہو کر ستانے کی غرض سے ایک دروازہ میں گھسنے لگا۔ احمد لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔ اور ہمدردی سے پوچھا "بھئی! کیا اتنی محنت کے بعد بھی تم کو اتنا نہیں ملتا کہ تم ثابت قمیض تو پہن سکو۔ تمہاری صورت سے میں کہتا ہوں تمہیں پیٹ بھر کر روٹی بھی میسر نہیں آتی"۔

تربوز والا۔ آغا! اللہ جب تک مدد نہ کرے۔ مزدوری میں کیا ملتا ہے۔

احمد۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اچھا تم سارے دن میں کیا کما لیتے ہو۔؟

تربوز والا۔ جناب میں تاجر نہیں۔ اجیر ہوں۔ دن بھر میں جتنے تربوز بکتے ہیں ان کی ساری قیمت میرا مالک لے لیتا ہے جس کی دوکان سوقِ سلطان میں ہے۔ پھر جو کچھ وہ مجھے ہاتھ اٹھا کر دے دے۔ میرے اچھے برے احوال سے اس کو کیا واسطہ؟

احمد۔ اور تمہارا نام کیا ہے؟

تربوز والا۔ نام تو اللہ کا ہے۔ مجھے حسن کہتے ہیں۔

احمد۔ میاں حسن تم آدمی بھلے معلوم ہوتے ہو۔ ذرا ادھر دیکھنا؟

احمد نے اپنا رومال کھول کر سونے کے پچاس چمکتے سکے اس کو دکھائے۔ حسن ٹکے کا مزدور اس کے باپ دادا نے بھی اتنی رقم کبھی نہ دیکھی تھی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

احمد کہنے لگا: "تمہارے پاس تو اتنی اشرفیاں نہ ہوں گی"؟

حسن۔ شاید میرے پڑوس میں بھی نہوں!

احمد۔ لوگے؟ دل تو للچاتا ہوگا؟

حسن۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) آقا! ہم کنگالوں کا ایسا نصیب کہاں؟ لالچ بھی آئے تو کریں کیا؟

احمد۔ لیکن اگر ذرا سا کسا لا کر جاؤ تو یہ پچاس کی پچاس اشرفیاں تمہاری ہیں۔؟

حسن۔ (احمد کا منہ دیکھ کر) افسوس۔ ایسے شریف ہو کر غریبوں سے مذاق کرتے ہو۔

احمد۔ واللہ مذاق نہیں۔ یہ ساری رقم تمہاری ہے۔ ذرا میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔

حسن۔ کسی دوسری ولایت؟ نابابا وطن چھوڑ کر کون پردیس جائے۔

احمد۔ نہیں بھئی شہر میں۔ مگر ایک شرط ہے؟

حسن۔ شرط بہت کڑی ہوگی؟

احمد۔ بالکل آسان۔ آنکھوں پر پٹی بندھوانی پڑے گی۔ تھوڑی دیر کا کام ہے۔ پھر جہاں سے لے جاؤں گا وہیں لا کر چھوڑ دوں گا۔

حسن۔ جہنم کا ایندھن تو نہیں اٹھوانا! مُردے تو نہیں دفن کرانے!!

احمد۔ (مسکرا کر) بلکہ جنت کی سیر کرانی ہے۔ کوئی وسوسہ دل میں نہ لاؤ۔

ساتھ ہی احمد نے اشرفیوں کی ایک جھلکی اور دی۔ روپے کے مقابلہ میں دور اندیشی کیسی؟ بڑے بڑے جرم کرنے کو انسان آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تو صرف آنکھیں ہی بندھوا کر جانا تھا۔ پھر ایک افلاس زدہ مزدور۔ حسن کے راضی ہونے میں کیا دیر تھی۔ احمد نے اس کی آنکھوں پر خوب کس کر پٹی باندھ دی اور ہاتھ پکڑ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

دل کا باولا ہونا اور بات ہے ورنہ احمد ایسا نادان نہ تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں حسن قدم نہ گن لے اور اسے میرے گھر کی سمت نہ معلوم ہو جائے۔ پہلے تو کئی سڑکوں کے چکر دئے۔ بیسیوں

گلیوں میں لئے پھرا اور جب وہ مطمئن ہو گیا کہ اب کھوج لگنا مشکل ہے تو چور دروازے سے اپنی حسرا میں داخل ہوا۔ اور آراستہ ایوان کے اندر جہاں ہزاروں فانوس روشن تھے۔ نفیس قالینوں کے فرش پر بٹھا کر پٹی کھول دی۔ حسن نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ حیران تھا کہ سوتا ہوں یا جاگتا۔ دیدے پھٹے ہوئے جسم بے حرکت۔ احمد نے تالی بجائی۔ فوراً کنیزیں حاضر ہوئیں اور اشارہ پاتے ہی چاندی کے طشت میں سونے کے آفتابہ سے تربوز بیچنے والے کے ہاتھ پاؤں دھلائے۔ پرانے میلے کچیلے۔ پھٹے پیوند لگے کپڑے اتار کر نہایت پر تکلف پوشاک پہنائی۔ پھر دسترخوان چنا گیا۔ قسم قسم کے لذیذ کھانے۔ طرح طرح کے میوے کھلائے۔ حسن کٹھ پتلی کی طرح کنیزوں کے ہاتھ میں تھا۔ جیسا وہ کہتیں بے چون و چرا کرتا۔ بیچارے کو یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ میں کہاں ہوں۔ وہ میرے ساتھ یہ کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟ اسی اثنا میں احمد نے انیس کو اطلاع دی کہ میں اپنے مقصد کے لئے ایک تربوز بیچنے والے کو لے آیا ہوں۔

تنبورے بجنے شروع ہو گئے اور نغموں کے ساتھ ساتھ انیس بھی چھم چھم کرتی آ پہنچی۔ حسن محفل کے حسن کا ساز و سامان ہی دیکھ دیکھ کر شیش محل کا گُتا بن رہا تھا۔ اب جو گانے کی سریلی آوازیں سنیں اور ایک پرستان کی پری کو اپنے سامنے ناچتے دیکھا تو اس کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ عجب حالت تھی، کبھی آنکھیں کھولتا، کبھی بند کرتا۔ منہ پھٹا ہوا گردن اٹھی ہوئی۔ بولنے کا یارا نہ تھا۔ غریب مزدور، چھوٹا ظرف۔ ایسا منظر خواب میں نزدیک ہوگا۔ آخر سمائی نہ ہوئی دیوانہ وار قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ہنستے ہنستے اپنی جگہ سے اٹھ کر انیس کے پاس پہنچا اور ان خوشبوؤں کو جو اس کے لباس میں سے آ رہی تھیں سونگھنے کے لئے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پھر انیس کی طرف ہاتھ پھیلا کر تین مرتبہ حورِ جنت کی حور، حور کہا اور کلمہ پڑھتا ہوا اس کے قدموں پر لوٹ گیا۔

تماشہ نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ انیس کو یقین تھا کہ احمد کی غرض پوری ہو گئی اس لئے وہ اس گنوار اور احمق تربوز بیچنے والے سے اپنا پیچھا چھڑا کر فری گت تمام نہ ہوئی

تھی کہ پردے کے پیچھے جا پہنچی۔ حسن بمشکل فرش سے اٹھی۔ اس نے جب پردے پہ تھیں۔ احمد نے
پوچھا کیا دیکھا؟ "جنت دیکھی اور جنت میں ایک حور کو ناچتے ہوئے۔ اللہ نے مجھے تو جیتے جی
بخش دیا۔ اس کی کرسی کے کیا کہنے"۔ حسن کی زبانی انیس کی یہ تعریف سن کر حد خوش تھا۔ حسن
کو تو پھر مزدور جس طرح لایا تھا ویسے جا کر چھوڑ دیا اور پچاس دینار تو لے گئے۔ اب اسے انیس
کو دیکھنے کی آرزو تھی۔ لوٹتے ہی اس کے کمرے میں پہنچا دیکھا کہ وہ بنی سنوری آئینہ کے سامنے
بیٹھی ہے۔ احمد کی آواز سنتے ہی کھڑی ہو گئی اور بولی "آج تو آپ مطمئن ہیں؟" احمد نے بڑی
گرمجوشی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا الحمد للہ! تم نے اپنی ہر آزمائش میں فتح پائی۔
اور میں نے خیال کیا کہ عبیداللہ نے اپنی دینداری کے غرور میں میرا کہا نہ مانا اور عمر بھر کی ملاقات
پر لات ماردی تو کیا ہوا۔ اللہ کی شان دیکھی ایک تربوز بیچنے والے سے میرے بھر پائے کرا دئے۔
وقت کی بات ہے مجھے بھی کیا سوجھی ہے +

چھٹا باب

حسن تربوز والا نرا گاؤدی نہ تھا۔ اپنے حلقے میں اس کی چرب زبانی اور مٹھار مٹھار کر باتیں کرنے کی بڑی شہرت تھی۔ ہزاروں مزے مزے کی کہانیاں اسے یاد تھیں۔ دن بھر کی محنت مشقت کے بعد رات کو جب وہ اطمینان کے ساتھ سلطان بازار میں آکر بیٹھتا تو اس پاس کے کنجڑے، قصائی، اونٹ والے، فراش، چوکیدار یا اسی جیسے مزدور اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ کہانیاں قصے ہوتے رہتے۔ یہ منہ بنا بنا اور ہاتھ نچا نچا کر کہتا اور سننے والے مزے لے کر سنتے۔ کہانیاں کہنے کا بھی ملکہ ہوتا ہے۔ علم و قابلیت پر منحصر نہیں۔ بعض جاہل عورتوں مردوں کو دیکھا ہے، ذرا سی بات کو ایسا بڑھا کر اور نمک مرچ لگا کر بیان کرتے ہیں جیسے کوئی داستان گو۔ حسن سے اب جو فرمائش کی گئی تو اس نے احمد کے ہاں کی اپنے اوپر گزری ہوئی داستان یہ کہہ کر کہ "روز تو جگ بیتی سنتے ہو آج آپ بیتی سنو" اول سے آخر تک اس طرح سنائی کہ لوگوں میں دور دور تک چرچا ہو گیا۔ واقعات میں صرف دینار ملنے کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے کہ نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں، اگر پولس والوں کو سن گن لگ گئی تو مفت میں اینچن کھینچن گھسیٹن میں پڑ جائے گا۔

واقعہ اپنی نوعیت میں عجیب تھا حسن نے سنایا تو کہانی کی طرح اور سننے والوں نے کہانی ہی سمجھ کر سنا، مگر دلی خواہش اس کی یہ تھی کہ لوگ کہانی نہ جانیں۔ وہ بلاناغہ روز رات کو یہی قصہ شروع کر دیتا اور ایک ایک بات کو پوری تفصیل کے ساتھ سنانے کی کوشش کرتا

تاکہ کم از کم اس کے حلقہ میں واردات سچی بھی جائے اور سننے والے اسے قصے کا ہیرو سمجھیں۔ تاہم وہ داستانی سے کام لیتا اتنا ہی لوگ ہنستے۔ حسن کوئی بڑا آدمی نہ تھا۔ اس کی حیثیت معمولی مزدور کی تھی۔ کسی کو کس طرح یقین آتا۔

بازار کی باتیں اکثر گھروں میں پہنچ جاتی ہیں۔ قرب و جوار میں حسن کے اس قصہ کا خاصہ چرچا ہو گیا۔ جس کے کانوں میں پڑا جھوٹ کا پلندہ سمجھا۔ سارے بغداد میں صرف احمد کے بچپن کا دوست عبید اللہ ایسا تھا کہ اگر اس کے کانوں میں اس کہانی کی بھنک پڑ جاتی تو ضرور سچا سمجھتا۔ لیکن وہ سلطان بازار سے بہت دور رہتا تھا۔ دوسرے اس کی شخصیت بھی ایسی نہ تھی کہ چھوٹی قوموں میں بیٹھتا اٹھتا، نشہ بازوں کی باتیں سنتا یا کہیں بھیڑ دیکھ کر ٹھٹک جاتا۔ قصہ مختصر جب غریب حسن اپنے اس آنکھوں دیکھے قصہ کی واقعیت کا یقین دلاتے دلاتے مایوس ہو گیا تو اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی ایک دوسری ترکیب نکالی۔ چلتے پھرتے، سوتے جاگتے کئی دن اس فکر میں لگا رہا کہ کس طرح اس واقعہ کو زیادہ رنگیں اور دلکش بنائے آخر اس نے پرانی کہانیوں کو اپنے قصہ میں ملا کر اس طرح کی ایک نئی کہانی گھڑی کہ رات کو دن بھر کا تھکا ہارا اپنے بستر پر پڑا سو رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جن آسمان سے اترا۔ جھک کر سلام کیا اور کہا ہمارے بادشاہ کا حکم ہے کہ حسن حمال کو ہمارے ملک کی سیر کراؤ۔ میں نے ہر چند ہاتھ پاؤں مارے لیکن وہ مجھے لے ہی اڑا۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں، اب جو کھلتی ہیں تو اندر کا اکھاڑا جما ہوا ہے۔ پرستان کا لباس پہنایا۔ پرستان کے کھانے اور میوے کھلائے اور راجہ اندر کے تخت پر مجھ کو بٹھا دیا۔ گانا بجانا ہونے لگا۔ ایک پری ایسا ناچی کہ در و دیوار، چرند و پرند وجد میں آ گئے۔ ناچتے ناچتے وہ کبھی میری گود میں آ بیٹھتی اور کبھی مجھے اپنے ساتھ رقص کرنے پر مجبور کرتی۔ سات رات دن میں وہاں مہمان رہا اور زندگی کا ایسا لطف اٹھایا کہ دیدہ نہ شنیدہ۔ وغیرہ وغیرہ اس کے بعد صبح کی اذان سے جو چونکا تو

'خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا'

اس سچے واقعہ کو جسے کوئی باور کرتا نہ تھا۔ اس گمراہ نے حسن نے بدل دیا۔ اور دماغ سے اتار اتار کر ایسی ایسی تُک بندیاں کیں، کہ جو سنتا تعریف کئے بغیر نہ رہتا۔ ادھر تو بلا ناغہ حسن اپنی اس بنائی ہوئی کہانی کو نئے نئے حاشیے چڑھا کر سناتا اور ادھر دل میں یہ چینک بھی لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح اس گھر کا پتہ لگ جائے جہاں سے وہ بے پئے متوالا بن کر آیا تھا۔ دن میں بار ہا اس کا احمد کے مکان کی دیوار کے نیچے سے گزر ہوتا۔ پھیری لگاتا ہوا آگے سے نکل جاتا۔ لیکن احمد کی چالاکی نے کھوج لگنے ہی نہ دیا۔ اندھی کوشش ناکام رہی۔

وقت کو گزرنے سے کون روکتا ہے۔ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آتی اور چلی جاتی۔ کہانی کیسی ہی دلچسپ ہو بار بار مزہ نہیں دیتی۔ دوسرے حسن بھی اکتا سا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ تربوز بیچنے والی کی یہ کہانی بھولی بسری ہو گئی۔ اس بات کو کئی مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن سر شام، ابو مخدوم بقال حسن کے پاس آیا۔ وہ بھی اپنے ٹھیے پر آکر بیٹھا ہی تھا۔ منڈلی جمنے میں دیر تھی، اور چپکے سے کہنے لگا "حسن مجھے اپنی کہانی ایک مرتبہ اور سناؤ، وہی جسے تم آپ بیتی کہتے ہو لیکن جیسی پہلے روز سنائی تھی۔ ایک لفظ بھی فالتو نہ ہو ورنہ تم سے شیطان سمجھے گا۔" احمد نے بلا تکلف بغیر اپنی طرف سے کچھ ملائے۔ سچا سچا قصہ کہنا شروع کیا۔ اتنے میں دوسرے لوگ بھی آنے لگے تھے۔ کہانی ختم ہوئی تو ابو مخدوم نے کہا تم پر چڑیل کا سایہ! دیناروں کی تھیلی بھی تو ملی تھی، وہ کیوں نہیں کہتے۔ خالی باتیں یاروں کو بانٹتے ہو۔ مال آپ ہی آپ کھا گئے۔"

بقال کی زبان سے پتہ کی بات سن کر حمال کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ جلدی سے اٹھا اور ابو مخدوم کو ایک طرف لے جا کر خوشامد کرنے لگا۔ پھیوں والے کا یہ منشا نہ تھا کہ منڈوا فروش کے دست غیب میں حصہ بٹائے بلکہ اصل چیز یہ تھی کہ ان ہی دنوں میں اس کے ساتھ بھی تقریباً ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ حالات دونوں کے بالکل مطابق تھے صرف حسین عورت کا لباس ایک نہ تھا۔ حسن نے اسے سنہری لباس میں دیکھا اور ابو مخدوم

نے سفید پھول دار کپڑے پہنے ہوئے۔ باقی ساری کہانی وہی۔ اب لوگوں کی دل لگی کیلئے حسن کے علاوہ ابومخدوم کا بھی اضافہ ہوگیا۔ کہانیوں کے شوقین آتے۔ کبھی اس کا قصہ سنتے کبھی اسکی داستان اور کہتے "تعجب نہیں عنقریب کسی تیسرے کے دماغ میں بھی یہ کیڑے جڑ جائیں" شہر میں زیادہ چرچا ہوا تو نکلی ہونٹوں اور چڑھی کوٹھوں' کے مصداق احمد کے کانوں تک بھی یہ کہانیاں پہنچیں۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا کہ اس کی نیس نے حسن کا پالا مار لیا۔ جہاں اس نے کسی کی زبانی ان کہانیوں کا کوئی ٹکڑا سنا فوراً گھر پہنچا اور اپنی بیوی سے جا دہرایا۔

اگلے زمانہ کے بادشاہوں کا دستور تھا کہ کبھی کبھی بھیس بدل کر شہر کا گشت کرتے اور اپنی نسبت لوگوں کے خیالات کی ٹوہ لیتے۔ بغداد کے عباسی خلفا کو اس کا بہت شوق تھا اور ہارون رشید کی تو یہ عادت ہی ہو گئی تھی۔ حمزہ بھی مہینے میں دو چار مرتبہ ضرور نکلتا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ خلیفہ اپنے وزیر ادریسی کے ساتھ غریبوں کا بھیس بدلے رعایا کی خیر خبر لیتا۔ پھرتا پھرتا سلطان بازار میں آنکلا۔ یہاں حسن اور ابو مخدوم کی کہانیوں کا ذکر سنا اور کچھ اس طرح سنا کہ ان کی سچائی کا یقین سا ہو گیا۔ اس کا تجربہ تھا کہ انسانوں کا یہ غیر متمدن طبقہ ایسا سفید جھوٹ نہیں بولتا۔ اپنے رفیق سے کہنے لگا کہ اس خوبصورت کنیز کا پتہ لگانا چاہئے" ادریسی بولا "ایسی حالت میں کہ ان دونوں پھیری کرنے والوں کو انتہائی کوشش کے باوجود کھوج نہ چلا۔ ہمیں کیوں کر نشان مل سکتا ہے۔ نہ محلہ معلوم نہ گلی۔ نہ یہ کہ مکان کس وضع قطع کا ہے۔ غرب رویہ ہے یا شرق رویہ۔ نو تعمیر ہے یا پرانا۔ بھلا اتنے بڑے شہر میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ خلیفہ نے کہا۔ خدا تم سے سمجھے۔ میرے دارالخلافہ میں ایسی باتیں ہوں اور مجھے ان کا علم نہ ہو۔ غضب ہے کہ نہیں: خیر تمہیں پانچ روز کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس مدت میں۔ مکان اور صاحب مکان کا نام و نشان معلوم ہو جائے ورنہ اپنی جان کی خیر نہ سمجھو۔

ادریسی ایک خواجہ سرا تھا۔ حرم کی چوکیداری سے خلیفہ کے مزاج میں دخیل ہو کر

اس نے وزارت کے درجہ تک ترقی کی تھی۔ اصل وزیروں کی سی دلیری اور بے خوفی اس میں کہاں؟ خلیفہ کا حکم سن کر بدن سنسنا گیا جان کی فکر پڑ گئی۔ اسی وقت سے اپنا کام شروع کر دیا۔ حسن اور ابو مخدوم کا یار بن کر بار بار کہانی سنی۔ ایک ایک بات کو کئی کئی مرتبہ کریدا۔ بال کی کھال کھینچ ڈالی اور اگرچہ ان دونوں نے اشرفیاں ملنے کا بھی اقرار کر لیا۔ لیکن منزل مقصود اندھیرے کی اندھیر میں رہی۔ کوئی راستہ ایسا نہ ملا کہ کہانی کی اصل جگہ پہنچے۔

ادریسی کے ڈرپوک ہونے میں تو کلام نہیں لیکن تھا بہت سُرتا۔ باوجود از حد تردد تشویش کے وہ برابر اپنے بچاؤ کی فکر کرتا رہا۔ دوسرے دن خلیفہ کے حضور میں حاضر ہو کر دست بستہ عرض کی "امیر المومنین غلام کا ایک خیال ہے؟"

خلیفہ۔ اور اس سے تمہاری جان بچ سکتی ہے؟

ادریسی۔ جان تو اللہ اور اس کے بعد حضور ہی بچا سکتے ہیں؟

خلیفہ۔ اچھا کہو۔

ادریسی۔ میرے آقا! اگر ابلیس جو فرشتوں میں ایک متکبر اور شوریدہ سر روح ہے۔ اس کہانی سے تعلق نہیں رکھتا تو پھر یہ فعل کسی ایسے انسان کا ہے جس کو غرور نے شیطان بنا دیا ہو۔ صرف ایک مغرور اور گھمنڈی آدمی ہی اپنے جذبات کے ایسے مظاہرے کر سکتا ہے۔

خلیفہ۔ گھمنڈ اور غرور سے کیا واسطہ؟

ادریسی۔ جہاں پناہ نے غور نہیں فرمایا۔ ایسے شخص کے سوا جو دولت کے نشہ میں بدمست نہ ہو بھلا دوسرا کون اپنے ناموس کو تماشہ بنائے گا۔ اور اپنی منظور نظر حسین کنیز کو اجنبیوں کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرے گا۔

خلیفہ۔ مانا کہ یہ کہانی کسی ایسے ہی آدمی کے متعلق ہے لیکن کیا شہر بھر میں اسے اپنی نمائش کے لئے بقال اور حمال ہی ملے؟

ادریسی۔ قبلۂ وکعبہ! یہ کوئی اچنبے کی بات نہیں۔ اس نے سمجھا کہ شرفا اور برابر والوں میں سے تو کوئی اس کے اندل کا حامی ہوگا نہیں۔ مزے لینا اور سراہنا تو کجا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ ملامت کا نشانہ بن جائے۔ اور ان حرکات کے بغیر اسے تسکین نہیں ہوتی، اسلئے وہ ایسے ہی آدمیوں سے اپنا مطلب نکالتا ہے جو ادنیٰ درجہ کے ہوں۔ چند سکے جن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیں اور جن کے قول و فعل کا عام طور پر کوئی اثر نہ ہو۔

خلیفہ۔ ادریسی تم اس وقت تمرہ کے حضور میں ہو۔ کسی مکتب میں فلسفہ کا درس نہیں دے رہے۔ یاد رکھو۔ ان کوری باتوں سے تمہاری اور تمہارے خاندان کی جان نہیں بچتی۔ یہ بتاؤ کہ اس گھمنڈی امیر کا کچھ پتہ لگا یا نہیں ادریس۔

ادریسی مارے خوف کے کانپ اٹھا۔ اسے اپنی گردن کے گرد دردسا محسوس ہونے لگا۔ زمین بوس ہو کر بولا "اے سلطان! وہ دونوں مرد جو اس قصہ کے راوی ہیں اور جنہیں کہانی کے سچ ہونے کا دعویٰ ہے۔ ایک ہی بازار میں رہتے اور ایک ہی جگہ اٹھتے بیٹھتے ہیں، روزانہ ان کا معمول ہے کہ اس چشم دید تماشے کا کچھ نہ کچھ بیان ضرور کرتے ہیں۔ سننے والے بھی نہیں اکتاتے"

خلیفہ۔ (بات کاٹ کر) پھر اس سے تیرا مقصد کیا ہے؟

ادریسی۔ (اپنی گفتگو کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے) میں سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خود پسند شخص اپنی تعریف کے گیت سننے ان بیکاروں کے پاس سلطان بازار میں ضرور آتا ہوگا۔

خلیفہ۔ آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ تیری جان بچنے کا کیا سامان؟

ادریسی۔ شاہزادہ نے اپنی جان کی سلامتی کے لئے یہ تدبیر سوچی ہے کہ ہم چھوٹی قوم کے آدمیوں کا سا روپ بنا کر جیسے نانبائی، باورچی، سقے، حجام، تیلی، مزدور، ساربان، دربان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خلیفہ۔ زیادہ بکواس نہ کرو۔ جو کہنا ہے جلدی کہو۔

ادریسی۔ جہاں وہ دونوں کہانی باز قصہ خوانی کرتے ہیں اس کے آس پاس لوگوں کی بھیڑ میں مل جائیں اور اس طرح کے فقرے کہہ کر وہاں کے آنے جانے والوں کو اپنی طرف متوجہ کریں کہ میں دس سال کی غلامی کا پٹہ لسے لکھنے کو تیار ہوں جو مجھے حسن تربوز بیچنے والے جیب تماشہ دکھائے۔ یا ابو مخدوم ہی کی آنکھیں تھیں۔ دوسرے سب اندھے ہیں۔ ایسی حسین صورت کا دیکھنا تو خدا کے نور کا دیکھنا ہے۔ یہ انسان غریب ہو کہ امیر، نیک ہو کہ بد۔ خوش قسمتی اور بد قسمتی کا فیصلہ پہلے ہی سے ہو جاتا ہے۔ نہ معلوم ہم بھی اللہ کے ان پیارے بندوں میں ہیں یا نہیں کہ اس کی اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی مورت کو دیکھیں! یا.......

خلیفہ۔ (اس طویل گفتگو سے اکتا کر) بس بس میرے کان تھک گئے، اور تیری زبان نہیں تھکتی۔

ادریسی کا مقصد گفتگو کو اس قدر طول دینے اور ذرا سی بات کو داستان بنانے سے یہ تھا کہ شاید خلیفہ کا خیال کہیں جم جائے اور اس کی جان بخشی ہو۔ کیونکہ حمزہ خود رائے اور تنگ مزاج آدمی تھا۔ ہمیشہ وہی کرتا جو اس کی سمجھ میں آجاتا۔ دنیا کی کوئی طاقت اور انجام کا بڑے سے بڑا تصور اس کے خیال کو نہ بدل سکتا۔ اپنے آقا کی طبیعت کے یہ انداز ادریسی کو معلوم تھے۔ اسلئے وہ نیچی نگاہیں کر کے خاموش اب بادشاہ کی رائے کا انتظار کرنے لگا۔ چنانچہ دو چار لمحہ کے بعد ہی خلیفہ نے فرمایا ''میری سمجھ میں ایک بہتر تجویز آئی ہے۔ ہم دونوں بھیس بدل لیں گے، تم سائیں کا اور میں دھوبان کا۔ پھر ہم ان دونوں حتال و بقال کے پاس کہانیاں سننے والوں میں مل جلکر بیٹھ جائیں گے۔ اور باری باری تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پکار پکار کر کہیں گے" واہ کیا کہانی ہے، اول ہی نہیں بھرتا۔ خواب میں ہی خدا ہمیں اس دنیا میں آئی ہوئی حور کی صورت دکھا دے۔

ادریسی۔ (دل میں خوش ہو کر) سبحان اللہ، سبحان اللہ!! حضور نے وہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ جسے فرشتوں کو بھی نہ سوجھے۔ واللہ کیا اچھوتا خیال ہے۔ اب اس میں ترمیم و تنسیخ کیسی

ہو سکتی ہے۔ خدا امیر المومنین کی عمر دراز کرے۔

تجویز پسند ہو گئی۔ خلیفہ اپنی خوش فہمی پر اور ادریسی اپنی جان بچنے سے دونوں خوش تھے۔ جوں توں کر کے دن گزرا۔ رات آئی۔ ایک سائیس بنا دوسرا دربان۔ تھوڑی دیر نہ ہوئی تھی۔ دیکھا کہ دونوں شاہ وزیر حسن اور ابو مخدوم کے پاس بیٹھے کہانی سُن رہے ہیں۔ یکایک انہوں نے ہانک لگانی شروع کی۔ کہانی کہنے والے کی نسبت زیادہ بلند آواز سے۔ آپس میں ایک دوسرے کو لقمہ دیتے ہوئے "مسلمانو! تمہیں قسم ہے جو ہماری نہ سنو۔ حسن اور ابو مخدوم جیسا تم میں سے کوئی تیسرا بھی نصیب والا ہے جنہوں نے جیتے جی بہشت کی سیر کر لی۔ حوروں کی سرتاج کو دیکھ آئے۔ اور سب سے بڑھ کر تو خوش قسمت وہ ہے جس کے گھر میں ایسی پری ہے۔ اس پر اس کے تھیدہ یہ خدا کی رحمت۔ اگر کوئی دنیا میں پرستان کا لطف اور فردوس کا مزہ اٹھا رہا ہے تو صرف ایک ہی انسان کو کہہ سکتے ہیں۔ ہم غریبوں پر اللہ ایسے کیوں مہربان نہیں ہوتا؟ افسوس تقدیر بھی ہماری ہنسی اڑاتی ہے۔"

اس قسم کے بہت سے فقرے کہہ کر خلیفہ اور ادریسی نے مجمع میں اپنے آپ کو نمایاں کیا۔ وہ چاروں طرف برابر دیکھتے رہے کہ شاید کوئی کچھ کہے۔ کہانی کے آخر تک انہوں نے اپنا یہی ڈھنگ رکھا مگر بے سود۔ لوگوں کی چہ میگوئیوں کے سوا کوئی کام کی بات سننے میں نہ آئی۔ ہار کر دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خلیفہ نے ناراضی کے ساتھ اپنے محل کا رستہ لیا اور ادریسی کا دل پھر دھکڑ پکڑ کرنے لگا۔ وہ خلیفہ کا مزاج پہچانتا تھا۔

احمد جوہری نے جب سے ان کہانیوں کی شہرت سُنی تھی۔ وہ بھی اپنی اور انیس کے حسن کی بابت لوگوں کے خیالات معلوم کرنے بھیس بدل بدل کر روز ہی رات کو کہانیاں سننے آتا اور الگ کسی کونے میں کھڑا ہوا سنا کرتا۔ خلیفہ اور ادریسی جس دن آئے تھے وہ بھی موجود تھا۔ اس نے ان کی ساری باتیں سُنیں اور بھانپ لیا کہ کوئی بڑے شوقین نظر آتے ہیں۔ لیکن سر بازار ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ دل میں یہ ٹھان کر کہ انہیں بھی انیس کا پتہ دکھانا چاہئے کیا یاد کریں گے۔ دور تک ان کا پیچھا کیا۔ بھیڑ زیادہ تھی اور وہ جھینپے ہوئے چلے جا رہے تھے اس لئے ہاتھ نہ آئے۔ گلیوں کے

موڑ توڑ میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ دوسرے روز پھر خلیفہ اور وزیر بھیس بدلے ہوئے آموجود ہوئے احمد بھی قصداً آیا۔ آج خلیفہ تو کچھ بولا یا نہ بولا۔ ادریسی نے کہ اسے اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی گزشتہ شب سے بھی زیادہ ڈھنگ پھاڑ کر کہا۔ کیا ہم غریبوں کو اللہ نے بالکل ہی بھلا دیا ہے۔ ہماری آنکھیں بھی کیا اس قابل نہیں کہ ایک جھلک ہی اس جمال جہاں آرا کی دیکھ لیں۔ اور پھر غمگین صورت بنا کر ہائے ہائے کرنے لگا۔

اِن دونوں کے مایوس چہرے اور شوق کا یہ حال دیکھ کر احمد کا دل پگھل گیا۔ اس نے چپکے سے دونوں کو اپنے پیچھے آنے کے لئے اشارہ کیا۔ دونوں پیچھے پیچھے ہو لئے۔ پہلے تو وہ انہیں اُس گلی سے اِس گلی میں اور اُس محلہ سے اِس محلہ میں پھراتا رہا پھر ایک کم آباد جگہ ٹھیر کر پوچھا۔ "حمال اور بقال کی کہانی تمہیں پسند ہے؟"

ادریسی۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) پسند کو کیا کریں۔ ویسا نصیب تو نہیں!

احمد۔ تو کیا تم بھی اس مکان میں جانا چاہتے ہو جہاں وہ دونوں گئے تھے؟

ادریسی۔ آدم کی اولاد اور جنت میں نہ جانا چاہے۔ آپ نے یہ کیا کہا؟

احمد۔ میں اگر تم سے کہوں کہ وہاں پہنچا دوں گا تو آپ اعتبار کریں گے؟

ادریسی۔ اے نیکی کے فرشتے جلدی کر۔ آخر بے اعتباری کا سبب؟

احمد۔ آنکھوں پر پٹی باندھنی پڑے گی!

ادریسی۔ کیا مضائقہ ہے۔ آسمانی جنت میں حوروں سے ملنے کی خاطر تو بالکل ہی اس دنیا سے آنکھیں بند کرنی پڑتی ہیں۔

لیکن خلیفہ نے ذرا تامل کیا۔ اسے اندھے بھینسے بننا اچھا نہ معلوم ہوا۔ احمد سمجھ گیا اور اس نے سرخ سرخ دیناروں کی پوٹلی دکھاتے ہوئے کہا کہ اس زحمت کا بدلہ بہت معقول ہے آپ خوش ہو جائیں گے۔ ادھر ادریسی نے جوہری کو پہچان لیا تھا۔ اس نے جلدی سے کہ کہیں خلیفہ انکار نہ کر دے اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ کچھ اشارہ سے کچھ کان میں کہہ اور رفع دفع کر لیا۔

تربوزوالے کے بعد بھلیوں والے کی قصیدہ خوانیاں۔ یہ توں کے افسانے اور افسانوں کی ہر دلعزیزی احمد کے سمندِ ناز پہ ایک کیا تازیانہ پہ تازیانہ ہوا۔ وہ اپنی خوش نصیبی کا خیال کر کے مغرور ہونے لگا۔ انیس کے ساتھ اسے بیحد شغف ہو گیا۔ انیس بھی خوش تھی کہ چلو ریڈ گئی پیڑ مٹی۔ تھوڑی سی کوفت ہوئی بلا سے آئے دن کا خلجان تو گیا۔ اس لئے وہ اب پوری بے فکری کے ساتھ رہتی۔ احمد اسے دنیا کی مخلوق سے بالاتر سمجھتا اور اس انیس کی جگہ شوہر کے تخیل کی انتہائی بلندیوں پر تھی۔ خدا کی شان وہی احمد جو عورتوں کو سات پردوں میں بھی مطعون کرنے میں تامل نہ کرتا تھا۔ عورتوں کی عفت وعصمت کے تحفظ کے یقین کی اس کے دل میں گنجائش ہی نہ تھی۔ یکایک ایسا بے غیرت ہو گیا۔ نفس کی ذرا سی خواہش نے اسے ایسا مغلوب کر لیا اور تھوڑی دیر کی واہ واہ کی خیالی مسرتوں نے اس کو ایسا اندھا کیا کہ اس کے سارے مذہبی اور شریفانہ جذبات ایک دفعہ ہی آندھی کے کوّے بن گئے۔ اسے اپنے باپ کی یہ بات بھی یاد نہ آئی کہ "ساری عورتیں اپنی ذات سے بری نہیں ہوتیں۔ ماحول کے اثرات بھی کوئی چیز ہیں۔ اور ان کے بگاڑنے، انہیں بدکار بنانے، ان کی فطرت کے بدلنے میں مردوں کا ضرور ہاتھ ہوتا ہے۔"

ابھی تک زوالِ حسن کے مسئلہ کا حل تو احمد کی سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن بتدریج یہ چیز اس کو ضرور محسوس ہو چلی تھی کہ ایرانی واعظ قمر الزماں کے نظریہ کو اس سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس کا حل اگر ہو گا تو کوئی اور۔ حسن ایک بجلی ہے۔ چمک کر چھپ بھی جاتا ہے۔ کسی کا قیدی نہیں۔ اُسے کسی ایک ذات تک محدود کرنا ظلم ہے۔ کیا کوئی سورج پر حکم چلا سکتا ہے کہ وہ اپنی کرنیں صرف ایک ہی شخص پر ڈالے؟ اسے تو ہمہ گیر ہونا اور ہر روح کو مسرور کرنا چاہیئے۔ احمد کا مقصودِ ذہنی نمیس کی نمائش سے حسن کو جلوہ گر کرنا تھا۔ اس سے اس کے جذبات کی تسکین بھی ہوتی رہتی تھی اور اسی غرض سے وہ حسن اور ابو مخدوم کو اپنے گھر لایا۔ رہا یہ سوال کہ اس کام کے لئے اس نے صرف غریب مزدور پیشہ اور کم درجہ کے اشخاص کا کیوں انتخاب کیا؟ یہ نہیں کہ اسے کبھی اس کا خیال نہ آیا ہو۔ وہ اکثر سوچتا بلکہ افسوس کرتا کہ انیس کے حسن کی مداحی کے لئے

کیا یہی نیچا طبقہ رہ گیا ہے؟ لیکن اسے ڈر تھا اگر یہی کُرکے کسی شخص کو لے آیا اور اس کی نیت بگڑ گئی تو کیا ہوگا؟ نہ صرف مجھے اپنی محبت سے ہاتھ دھونا پڑے گا بلکہ حُسن یعنی انیس کو بھی نقصان پہنچنا یقینی ہے۔

لاکھ محتاط ہوا انسان تو کیسا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

انسانی مجبوریاں ایسے ہی موقعوں پر تو دیکھی جاتی ہیں۔ ہونے والی بات احمد کی تقدیر میں خلیفۂ حمزہ اور اس کے وزیر ادریسی کو اپنے ہاں بلانا لکھا تھا۔ وہ ان دونوں کو جو سائیس اور دربان کے بھیس میں تھے اسی طرح آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر لے آیا جس طرح دوسروں کو لایا تھا۔ اور ان بغداد کے حکمرانوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کئے جو حمال و بقال جیسے فلاکت زدوں کے ساتھ کئے تھے۔ قصہ کوتاہ جب ابتدائی مرحلے طے ہو چکے تو رقص شروع ہوا۔ خلیفہ اور ادریسی خاموش بُت بنے ہوئے بیٹھے تھے۔ صرف کان اور آنکھیں کام کر رہی تھیں۔ حمزہ اپنے محل میں ایک سے ایک حسین مغنیہ اور رقاصہ کو دیکھتا تھا۔ خلافت کی عشرت گاہوں میں حُسن و جمال کی کیا کمی۔ مگر انیس کے مقابلہ میں سب گرد تھیں۔ خلیفہ نے ادریسی کی طرف اشارہ کیا اور ادریسی نے بھی اشاروں میں پوری داد دی۔

رقص و سرود ختم ہونے کے بعد بھی یہ دونوں چُپ تھے۔ کسی کو کیا خبر کہ اس وقت خلیفہ اور اس کا وزیر کہاں ہے؟ یہاں نہ کوئی ان کی جان کا محافظ تھا نہ ان کے اشاروں کو سمجھنے والا۔ اس دلیری سے اجنبیوں میں اس طرح تنہا آجانا کچھ ان ہی اقبال مند شخصی حکمرانوں کو سزاوار تھا۔ بادشاہوں کے دوستوں سے زیادہ دشمن ہوتے ہیں۔ ایسے تخلیہ کے موقع پر موت کے گھاٹ اتار دینا کیا مشکل ہے۔

یک بہ یک ادریسی اس تصور سے چونکا۔ خلیفہ کا زانو دبا کر چلنے کا اشارہ کیا۔ احمد نے ہر چند کچھ اور بیٹھنے کے لئے اصرار کرنا چاہا مگر ادریسی بے چین تھا اس نے کہا کہ "ہم کو اب زیادہ دیر ٹھیرنا نہیں چاہئے۔ ہم نے ایک ایسے نور کا جلوہ دیکھا ہے کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ ڈر ہے کہ اگر وہ دوبارہ

نظر آگیا تو ہم اندھے ہو جائیں گے یا ہم پر بجلیاں گرنے لگیں گی" اور جھوٹ موٹ اُن کرکے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ منہ چھپانے میں بھید کی بات ایک یہ بھی تھی کہ احمد باوجود صورت کی تبدیلی کے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ادریسی کی اس حرکت پر احمد کسی قدر مسکرا کر بولا "آپ پریشان نہوں۔ کوئی طور کی تجلی آپ نے نہیں دیکھی۔ میں نہ کسی طلسم کا مالک ہوں نہ پرستان کی پری یا جنت کی حور میرے قبضہ میں ہے۔ اسی دنیا سے جب نگل کی ایک مورت تھی جو آپ کو نظر آئی۔ ہاں یہ منظر آپ بھول نہیں سکتے" یہ کہہ کر اس نے پچاس پچاس دینار سرخ کی دو تھیلیاں پیش کیں اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ دور شہر کے کسی اجڑ حصہ میں چھوڑ آیا۔

آنکھوں سے پٹیاں ہٹیں۔ احمد نظروں سے غائب ہو گیا تو خلیفہ کی چھاتی کے کواڑ کھلے اس نے ترچھی نگاہوں سے ادریسی کی طرف دیکھا اور تحکمانہ لہجہ میں کہنے لگا "سنتا ہے او خبیث! اس کا رقص میرے باغ کی بارہ دری میں ہونا چاہئے اور وہ بھی کل شام کو، ورنہ تلوار تیری گردن پہ ہوگی"۔ ادریسی کا خون خشک ہو گیا لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات۔ بادشاہ نہیں سننے کے عادی ہی نہیں ہوتے۔ وزیر نے عرض کیا "امیر المومنین ایسا ہی ہوگا۔ البتہ یہ کام رازداری چاہتا ہے۔ میں نے یہ تدبیر سوچی ہے کہ کل جب احمد اپنی دوکان پر ہو ہم اسے اڑا لیں۔

خلیفہ۔ (تیور بدل کر) میں یہ کچھ نہیں جانتا۔ میرا منشا پورا ہونا چاہئے اور بس +

ساتواں باب

انیس جلیس اپنے خلوت کے کمرہ میں بیٹھی بڑے انہماک کے ساتھ نہایت خوش الحانی سے کلام اللہ کی تلاوت کر رہی تھی کہ ایک غلام بے سر و پا بھاگا ہوا آیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا "بی بی! نہ جانے کون حرم کے دروازہ کو توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کر رہا ہے!" غلام ابھی اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ ایک کنیز کے بے تحاشہ چیخنے کی آواز آئی۔ انیس حیران تھی کہ کیا معاملہ ہے؟ اتنے میں کیا دیکھا کہ دس بارہ نقاب پوش، بے غلاف خنجر اور ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے اندر چلے آتے ہیں۔ ان کے پیچھے اسی وضع قطع کے آدمیوں کی ایک ٹولی اور بھی ہے۔ احمد گھر پر نہ تھا۔ چند خدام کیا کر تے۔ کنیزوں کے رونے دھونے سے کیا ہوتا۔ نقاب پوش نے بے دھڑک لوٹ مار شروع کر دی۔ چاندی سونے کے برتن۔ آرائش کا قیمتی سامان۔ ایرانی اور ترکی قالین غرضکہ انیس کے خلوتکدہ میں جو کچھ تھا سب سمیٹ اور خود اسے بھی اٹھا پچھلے دروازہ سے چمپت ہوئے۔

جب تک ڈاکہ پڑتا رہا کسی نے سانس تک بھی نہ لیا۔ سب دم چرائے دیکھتے رہے۔ ان کے نکلتے ہی کوسنے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ چلیو دوڑیو کا شور مچ گیا۔ ایک غلام احمد کو خبر دینے دوڑا۔ پولیس میں بھی اطلاع دی گئی۔ مگر یہ رعایا کی جان و مال کا نگہبان محکمہ ہمیشہ سے ایسا ہی دیر آشنا اور سرد مہر ہے جیسا آج۔ ضابطہ پری کئے بغیر مجال نہیں کہ یہ قدم اٹھائیں۔ کوتوال صاحب نے اپنے نائب کی سرکردگی میں ایک جمیعت بھیجی۔ کب؟ احمد کی دنیا اندھیر ہونے کے

عرصہ کے بعد۔ گو یہ چوری نہ تھی سینہ زوری تھی۔ بروقت مدد پہنچ بھی جاتی تو کیا ہوتا۔ اور ممکن ہے کہ کوتوال کو بھی سانٹھ لیا گیا ہو۔ تاہم پولس نے اپنی کارگزاری بتاوٹی ہی سہی دکھانی شروع کردی۔ باقاعدہ تفتیش ہونے لگی۔

احمد کی دوکان بہت دور تھی۔ کئی لمبے لمبے گنجان بازار طے کرنے پڑتے تھے۔ غلام بھی کچھ سست قدم تھا وہ دیر میں پہنچا۔ پھر بھی پولس نے اپنی کارروائی ابھی شروع کی ہی تھی کہ احمد سرپٹ گھوڑا دوڑاتا آپہنچا۔ محسرا کے باہر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اندر قدم رکھا تو دروازہ دریچے چوپٹ کھلے۔ پردے پھٹے ہوئے۔ آرائش نوچی کھسوٹی۔ سامان تتر بتر۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ انیس غائب۔ بدمعاش کہو یا ڈاکو اسے بھی اڑا لے گئے ہیں۔ احمد کے ہوش کیا ٹھکانے رہتے۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔ پولس والوں کو اُن کی غفلت اور بےخبری پر ملامت کی۔ سوار ادھر اُدھر دوڑائے۔ کئی گھڑچڑھے سپاہی اپنے ساتھ لے کر آبادی کا ایک ایک کونا چھان مارا۔ جس سازش میں خود حکومت کا ہاتھ ہو اس کا پتہ چلنا کیا ہنسی کھیل ہے۔ احمد حیران تھا کہ انیس کو زمین کھا گئی یا آسمان۔ بازاروں میں جس سے پوچھتے ہیں کوئی نہیں بتاتا۔ بتائے کون؟ اور کہے بھی تو کیا۔ ڈاکو آئے ہوں۔ ڈاکہ پڑا ہو تو کچھ بتائیں۔ نشان دیں۔ وہاں تو محافظ چور تھے۔ پہرے داروں نے لوٹا تھا۔

احمد جوہری کے گھر سے کچھ فاصلہ پر ایک نہر بہتی تھی۔ دریائے دجلہ کا پانی اس کے ذریعہ سے شاہی باغ کی پرورش کرتا تھا۔ کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی لدی سی کشتیاں۔ ہلکے پھلکے نواڑے بھی اس میں سے گزرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جو باغ سے دریا میں اور دریا سے باغ میں خلیفہ کی عشرت رانیوں کا سامان لاتی اور لے جاتی تھیں۔ اس باغ کا نام ”نشاط باغ“ تھا۔ ایک نہایت خوبصورت بارہ دری بھی اس میں بنی ہوئی تھی۔ یہ گویا عوام کی نظروں سے الگ شاہی عیش خانہ تھا۔ انیس جلیس کو دیکھا کہ یہاں ایک طرف سُکڑی سمٹی منہ پر نقاب ڈالے بیٹھی ہے

اور خلیفہ اس کے سامنے لباس فاخرہ پہنے پہلو میں تلوار لٹکائے کھڑا ہے۔

خلیفہ۔ (بغیر اپنی شخصیت جتائے مسکراتے ہوئے) یہ نقاب کب تک پڑی رہیگی۔ ہم تمہاری صورت کے مشتاق ہیں۔

انیس۔ جناب! میں ایک مسلمان، شریعت کی پابند عورت ہوں۔ نامحرموں کے سامنے بے نقاب نہیں ہو سکتی۔

خلیفہ۔ (ذرا سخت لہجہ میں) کیا تمہارے شوہر نے تمہیں بے پردہ نہیں کیا، اور کیا تم نے احکام قرآنی پر اب تک پورا عمل کیا ہے؟

یہ سن کر انیس نے خلیفہ کو غور سے دیکھا۔ وہ پہچان گئی کہ گزشتہ شب احمد جن دو شخصوں کو لایا تھا ان میں سے ایک یہ ہے۔ خوف کے مارے اس کا جسم کانپنے لگا کہ ضرور یہ کوئی دولتمند حُسن کا ڈاکو ہے۔ تاہم اس نے اپنے حواسوں کو منتشر نہ ہونے دیا۔ سوچا کہ تقدیر کا مقابلہ فضول ہے۔ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ مگر احمد کی محبت کا دامن نہ چھوڑنا چاہئے جس کے پلّے سے بندھ گئی بندھ گئی۔ اور دل مضبوط کر کے بولی "افسوس میرے شوہر احمد نے جو کل آپ کی مہمانی کی انتہائی مہربانی اور عزت کے ساتھ آپ سے پیش آیا کیا اس کا صلہ یہی ہے؟ اور وہ آپ کا ساتھی کہاں گیا"؟ خلیفہ نے جب دیکھا کہ بھید کھل گیا۔ انیس نے اسے پہچان لیا تو کہنے لگا کہ "جب تم مجھے جان گئیں تو پھر مُنہ چھپانے کے کیا معنی۔ میں غیر نہیں رہا۔ جیسے ایک مرتبہ دیکھا ویسے ہزار دفعہ دیکھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اسی خوبی و خوش نمائی کے ساتھ ایک دفعہ اپنا رقص اور دکھا دو"۔

انیس۔ آپ نے مجھے بے پردہ ضرور دیکھا لیکن اس وقت میں اپنے شوہر اور آقا کے حکم سے مجبور تھی۔ وہ میرے پاس موجود تھا۔ اس کے جذبات میرے محافظ تھے۔ یہ شکل دوسری ہے۔ میں اس کی آنکھوں سے اوجھل کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتی جو اس کی ناموس کو داغ لگائے۔ مجھے اغوا کرنے میں آپ نے ناحق کوشش کی۔

خلیفہ۔ (تیور بدل کر سختی سے) کنیز! ہوش میں آ۔ جانتی نہیں کس کے سامنے زبان

چدرہی ہے۔ میں حاکم وقت خلیفہ حمزہ ہوں۔

یہ سنتا تھا کہ انیس بیہوش ہوکر زمین پر گر پڑی۔ بداعمال آدمی خواہ وہ والیٔ ملک ہی کیوں نہ ہو خلاقی بزدل ضرور ہوتا ہے۔ خلیفہ نے انیس کی جو یہ حالت دیکھی سٹپٹا گیا۔ دل میں پشیمان تھا کہ ایسی بات کیوں کہی جس نے عیش میں کھنڈت ڈال دی۔ گھبرا کر تالی بجائی۔ ادریسی بھاگا ہوا آیا۔ خواجہ سرا نے ایسے خواب پریشان بہت دیکھے تھے۔ مگر بظاہر ایسی صورت بنائی جیسے کوئی تشویش ناک معاملہ ہے۔ خلیفہ نے انیس کو بستر پر لٹانے اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے کو کہا۔ ادریسی انیس کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر لے گیا۔ پر تکلف گدگدے بچھونے پر لٹا دیا۔ پنکھا جھلا۔ قرآن مجید کی آیات شفا پڑھ کر کان میں پھونکیں لخلخے سنگھائے گلاب کے چھینٹے دئے اور جب انیس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی تسلی تشفی کی۔ ہر طرح سے اطمینان دلایا۔

انیس نے ادریسی کو بھی پہچان لیا کہ دوسرا یہ ہے جس کے سامنے میں نے رقص کیا تھا لیکن اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ چپ بیٹھی سنا کی۔ ادریسی نے پھر چاپلوسی شروع کی اور ہمدردی کے ساتھ کہنے لگا "یقین، تو تمہیں میری مرضی کے خلاف یہاں لایا گیا ہے۔ میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ بندگی۔ بیچارگی۔ تم خود عقلمند ہو سمجھ لو کہ ایک خادم آقا کی فرمانبرداری نہ کرے تو کہاں رہے۔ اور آقا بھی حمزہ جیسا ضدی۔ بدمزاج۔ لیکن خاطر جمع رکھو تمہارا بال بیکا نہیں ہو سکتا۔ میری جان تمہاری آبرو کے ساتھ ہے۔ بہت جلد تمہارے گھر واپس پہنچانے کی کوشش کروں گا۔"

ایسے نازک وقت کہ نہ کوئی مونس تھا نہ ہمدم، نہ یار نہ مددگار ادریسی کے روغن قاز نے انیس کے دل پر وہی کام کیا جو خشک کھیت میں ابر رحمت سے برسنے والی چند بوندیں کرتی ہیں مثل مشہور ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ انیس کو کچھ ڈھارس بندھی۔ آخر عورت ذات تھی ادریسی کی چکنی چپڑی باتوں پر اعتماد سا ہو گیا۔ اس نے پوچھا "آخر مجھے کیا کرنا چاہئے؟

ادریسی نے جواب دیا۔ سمجھ لو۔ تم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ اس وقت ترہ ہٹ اور راج ہٹ کا مقابلہ ہے۔ تم بے بس ہو وہ طاقتور۔ خلیفہ اگر بگڑ گیا تو تمہارا اور تمہارے ساتھ احمد کا بھی برا حشر ہوگا میں یہ صلاح نہیں دیتا کہ تم بالکل اس کا شکار ہو جاؤ۔ لیکن ذرا اپنی ضد بھی چھوڑ دو۔ بخار سے اگر موت ٹل جائے تو کیا برائی۔ میں پوچھتا ہوں کہ تمہیں ایک بار رقص کرنے سے کیوں انکار ہے؟

انیس کانپ اٹھی، اس کا دماغ کچھ کام نہیں کرتا تھا کہ کیا کہے۔ اپنے خیالات میں بالکل کھوئی ہوئی تھی۔ ادریسی نے اس کے تصورات کا سلسلہ توڑنے کے لئے پوچھا "اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم اور تمہارا شوہر کتنے عرصہ سے اور کیوں اس قسم کے تماشہ دکھانے میں لگے ہوئے ہیں"۔

انیس پہلے ذرا متامل ہوئی پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنی محبت کا افسانہ، احمد کے خود ساختہ مصائب، صحرا کا سفر، قمر الزماں ایرانی واعظ کی ملاقات وغیرہ سارے واقعات بے کم و کاست سنا ڈالے اور کہا کہ میں نے جو کچھ کہا یا جتنی حرکتیں مجھ سے سرزد ہوئیں وہ اول سے آخر تک اپنے شوہر کی خوشنودی کیلئے تھیں۔ میری اپنی کمزوریوں کا مطلق دخل نہیں۔

ان دونوں میں ابھی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خلیفہ کا بھیجا ہوا ایک خواجہ سرا انیس کی مزاج پرسی کیلئے آیا۔ ادریسی نے جواب میں ایک کاغذ کے پرزے پر یہ لکھ کر بھیجدیا کہ "اس کی طبیعت پورے طور پر بحال نہیں، امیر المومنین کل صبح تک توقف فرمائیں" خواجہ سرا چلا گیا تو انیس نے یہ کہہ کر اپنی کہانی ختم کی کہ "غالباً اب آپ کے بہت سے شبہات رفع ہو گئے ہوں گے"۔

ادریسی نے آج سے پہلے کبھی ایسا عجیب قصہ سُنا نہ تھا اسے بڑی حیرت ہوئی کہ دنیا میں ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں؟ اگر حوریں کوئی نئی مخلوق نہیں تو یہی جنت میں حوریں بن جائیں گی۔ اس نے انیس کی سیرت اور صورت دونوں کی بہت تعریف کی، صرف زبان سے نہیں بلکہ دل سے بھی اور اس کے اطوار، اس کی اطاعت شعاری اور قربانیوں کا قائل ہو گیا۔

ادریسی۔ (انیس کو خوش کرنے کے لئے) شوہر کے ساتھ تمہارے تعلقات قابل رشک ہیں۔ خدا انہیں اور مضبوطی کے ساتھ تادیر قائم رکھے۔ عجیب فیاضانہ فطرت خدا نے تم کو دی ہے۔

احمد کا یہ حال کہ اس نے تمہارے حُسن کو تماشہ بنایا اور تم بدستور اس کی رہیں بلکہ اور زیادہ اسکا دم بھرنے لگیں۔ درحقیقت تمہاری محبت مثالی سے حقیقی ہو چکی ہے۔ تم دونوں اپنے اپنے تخئیل میں اپنا جواب آپ ہی ہو۔ خلیفہ تم سے تمہارے شوہر کو کیا چھڑا سکتا ہے۔ موت بھی شاید اس محبت کے رشتہ کو نہ توڑ سکے۔

انیس۔ (خوش ہو کر وزیر کی طرف دیکھتے ہوئے) اگر آپ کی زبان حقیقت میں دل کی ترجمانی کر رہی ہے۔ اور آپ کے الفاظ اپنے اندر کوئی پوشیدہ راز نہیں رکھتے۔ تو پھر مجھے احمد کے پاس کیوں نہیں پہنچوا دیتے۔ نہ جانے احمد نے میری جدائی میں اپنا کیا حال کر لیا ہوگا۔

ادریسی۔ (ٹھنڈا سانس بھر کر) زبان سے نکلے ہوئے الفاظ تم سنتی ہو اور دل کی آواز اللہ۔ میرا بس چلتا تو یہ صورت ہی پیش نہ آتی۔ تم برا مانو یا بھلا۔ ہے یہ سب تمہارے شوہر کا کیا دھرا۔ اس نے تمہیں خلیفہ کو دکھا کر اپنے پیروں آپ کلہاڑی ماری۔ خیر ہو چکا سو ہو چکا لیکن کیا تم یہ نہیں مانتیں کہ آنکھوں کے ذریعہ بھی حُسن کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے؟ اس میں تم کیا ہرج سمجھتی ہو کہ تمہاری ہر چیز کا مالک احمد ہے اور صرف نگاہوں سے خلیفہ کو متمتع ہونے کا موقع دو۔ خلیفہ اگر ناراض ہو گیا تو پھر میری ہمدردی بھی دھری رہ جائیگی احمد کی زندگی کا بھی خدا حافظ ہے اور کچھ عجب نہیں کہ تمہاری ساری خوشیاں آہ و زاری سے بدل جائیں۔

انیس۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) میری تقدیر! جو کچھ بھی ہوا! مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔ شوہر سے بیوفائی اور اس کی امانت میں خیانت مجھ سے کبھی نہ ہوگی۔

ادریسی۔ (تقریر کا ایک دوسرا پہلو بدل کر) یہ تو ظاہر ہے کہ احمد نے تمہاری نمائش کی محض اس یقین کے لئے کہ تم صرف اس کی آنکھوں ہی میں حسین ہو یا دوسرے بھی تمہیں خوبصورت سمجھتے ہیں۔ تمہارا جمال ایک اسی کی نظروں کو جذب کرتا ہے یا دلوں کو تسخیر کرنے کی اس میں عام کشش ہے۔ نیچے درجہ کے لوگوں کی رائے تو اسے معلوم ہو گئی۔ لیکن کیا چند

مبتذل آدمیوں کی تعریف تمہارے حسین ہونے کی مکمل تصدیق کر سکتی ہے۔ ایسے بے شعور جن کے گھروں میں نہ کنیزیں ہیں نہ حسن پرستی کا سامان۔ ان کی آنکھوں کا کیا اعتبار؟ کسوٹی بڑے آدمیوں کی نگاہ ہے۔ جن کا سوا اس کے کوئی دوسرا شغل ہی نہیں۔ سنا ہوگا "قدرِ گل بلبل بداند یا بداند باغباں"۔ تو آج دنیوی حیثیت سے بادشاہ کی برابری کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ سارے بغداد کی ناک، دنیا بھر کی ایک سے ایک طرحدار کنیز اس کے محل میں موجود۔ بہت ممکن ہے کہ نبب احمد یہ سنے کہ خلیفہ حمزہ نے تمہارے حسن و کمال کی داد دی ہے اس کا رہا سہا شبہ بھی دور ہو جائے اور تم اس کی آنکھوں میں زیادہ محبوب ہو جاؤ۔ ایک ایسی چیز کے مطالبہ میں جو تمہارے شوہر کے عین منشا کے مطابق بلکہ اس کی مزید خوشی کا باعث ہو۔ تمہیں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔

تقریر مدلل تھی۔ اس کے علاوہ حالات بھی ناساز گار۔ اندیشہ تھا کہ جواب دے کر کوئی اور آفت نہ مول لے لے۔ اتنی ہمدردی سے بھی جائے۔ اس لئے وہ چپ ہو گئی۔ لیکن اس کے تمام اعضا کانپ رہے تھے اور دل میں اس نے پورے طور پر یہ تہیہ کر لیا تھا کہ جان جائے یا رہے بے عصمتی کا داغ اپنے دامن پر نہ لگنے دے گی۔ اس اثنا میں عشا کی اذان ہوئی نماز کا وقت آ گیا۔ ادریسی شب بخیر کہہ کر رخصت ہوا۔ انیس کو قیدی تو کون کہہ سکتا ہے۔ نظر بند تھی۔ کھانے پینے، آرام و راحت کے جملہ لوازمات مہیا تھے لیکن جب دل ہی ٹھکانے نہ ہو تو۔

مع ہوک کس کی پیاس کیسی، بدمزہ تھی زندگی۔

کسی چیز کو ہاتھ لگانا کیا نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔ دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھی رہی کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے؟ رات زیادہ آئی اور کسی کے پاؤں کی آہٹ تک نہ سنائی دی تو اٹھی۔ برابر کے کمروں میں جھانکا۔ ایک کمرہ میں اپنی استراحت کا سامان آراستہ پایا۔ اندر گئی۔ کچھ دیر کے لئے اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنی خوابگاہ میں ہے۔ خلیفہ نے

اس کمرہ کو اسی کے اسباب زینت سے سجا رکھا تھا۔ کمی تو صرف احمد کی۔ وہ یہاں کہاں۔؟ اس کی جگہ رنج و غم ہم جلیس تھے۔ اور جوں جوں وہ گزشتہ رات کا آج کی رات سے مقابلہ کرتی اس کا دل بیٹھا چلا جاتا۔ غلط ہے کہ سولی پر بھی آ جاتی ہے نیند۔ وہ لیٹی۔ آنکھ لگنا کیسا؟ پلک تک نہ جھپکی۔ رات بھر تڑپتی۔ کروٹیں بدلتی اور ادریسی کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ کبھی اسکے ان دلائل کے صدق و کذب کا اندازہ لگاتی جن پر آئندہ کی زندگی منحصر تھی۔ کبھی اسے احمد کی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا تصور طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کر دیتا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر سارے بغداد میں اپنی ذہنیت اور اپنے تخیلات کے اعتبار سے ایک عجیب انسان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انیس نے ایک عرصہ تک احمد کے ساتھ رہ کر اپنی نیک چلنی کا اعتماد پیدا کر دیا تھا اور احمد نے بھی انیس کے جسم و روح میں اپنی محبت اس طرح پیوست کر دی تھی جیسے ناخن اور گوشت "ایک جان اور دو قالب" تاہم اس کی سریع الانفعال طبیعت بھی غضب کی تھی۔ خیال کی ذراسی لغزش۔ بدگمانی کا ایک جھٹکا دونوں کے باہمی پیمانِ محبت کو توڑنے کے لئے کافی تھا۔

علی الصباح نماز سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے ادریسی انیس کے پاس آیا۔ مزاج پوچھا۔ انیس نے طبیعت کا حال بیان کرنے کے بدلے اس سے درخواست کی کہ "آپ اپنی مہربانی فرمائیں کہ کسی طرح میرے شوہر سے ملیں۔ میری تقدیر پھوٹنے کا ماجرا سنائیں اور بادشاہ کی خواہش بیان کر کے اس کی اجازت حاصل کریں"۔ وزیر ہنسا کہ کس قدر سادہ لوح بھولی بھالی لڑکی ہے۔ واقعی انیس اس وقت بچوں کی سی باتیں کر رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر بے لوث محبت کا نور تھا۔ اس کے جذبات کسی خارجی اثر سے مغلوب نہیں ہوئے تھے بلکہ اس نے اپنی محبت کے مشورہ سے ایک اخلاقی قانون وضع کیا تھا۔ محبت کو کسی کی ہنسی یا مذاق اڑانے سے کیا بحث؟ وزیر نے اس کو سمجھایا کہ نادان خاتون! یہ تمہاری اپنی رائے ہے۔ میں اس پر عمل نہیں کر سکتا۔ جس فضا میں اس وقت تم ہو

اس کے ضابطے ہیں، میں خود مختار نہیں۔ قانونِ سیاست کا قیدی ہوں۔ میرا فرض ہے کہ حکومت کے ادنیٰ سے ادنیٰ معاملہ میں بھی خلیفہ کی اجازت حاصل کروں۔

انیس۔ (ادریسی کا منہ دیکھ کر) کیا سیاست اس کو کہتے ہیں؟

ادریسی۔ شخصی بادشاہوں میں سیاست کا یہی مفہوم ہے۔ فرماں روا کی مرضی کے خلاف پتّہ بھی کھڑکے تو سارا درخت اکھیڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

انیس۔ آپ تو وزیرِ سلطنت، مدار المہام ہیں۔ کیا آپ کو اتنا اختیار بھی نہیں؟

ادریسی۔ نہیں، میں مجبورِ محض ہوں۔ بلکہ اوروں سے زیادہ میری ذمہ داریاں ہیں۔ مجھ کو چاہیے کہ ہر بات کے لئے ہر بار نیا حکم لوں۔ اگر کسی خاص معاملہ میں یا کسی مصلحت سے فوری اجازت نہ لے سکوں تو پہلی فرصت میں لازمی طور پر اطلاع دوں۔ اب یہ خلیفہ کی مرضی ہے کہ وہ مانے یا نہ مانے۔ مان لیا تو مراحم خسروانہ کہلائے گا۔ نہ مانا تو قیامت ہے جواب طلب ہوگا۔

انیس۔ مگر یہ چیز تو سیاسی نہیں؟

ادریسی۔ اسی لئے تو زیادہ اہم ہے۔ اس کا تعلق خلیفہ کی ذات سے ہے اور ذاتی معاملات میں دخل دینا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ اس میں تو جواب بھی طلب نہیں ہوگا بلکہ جلاد کی تلوار ہوگی اور میرا گلا۔

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ ادریسی اور انیس کی باتیں ہو رہی تھیں کہ خلیفہ تشریف لے آئے بُشرہ اندرونی جذبات اور آنکھیں دل کی غمازی کر رہی تھیں۔

خلیفہ۔ (انیس کے پہلو میں کھڑے ہو کر) کہو، کیا سوچا۔ میرے حکم کی تعمیل کرنی ہے؟

انیس بیٹھی ہوئی خلیفہ کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے ذبح ہونے والی بھیڑ قصائی کو دیکھتی ہے۔ وہ جان سے عاجز تھی اس نے دل میں کہا۔ ہر چہ باشد اور پکار کر بولی "نہیں ہرگز نہیں" اور اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپالیا۔

خلیفہ کے تیور بدل گئے۔ وہ اپنے غصہ کو دباتا ہوا پھر باہر چلا گیا۔ ادریسی جو خلیفہ کے آتے ہی ان دونوں کو تنہا چھوڑ کر ٹل گیا تھا۔ اندر آیا اور خوفزدہ صورت بنا کر کہنے لگا "انیس! کیا ابھی تک تمہارے حواس درست نہیں ہوئے، میری دماغ سوزی بیکار رہی۔ کیوں موقع کھوتی ہو۔ مفت میں اپنے ساتھ دوسروں کی بربادی کا سامان تو نہ کرو۔"

ادریسی خواجہ سرا تھا۔ اس قسم کے لوگ عموماً دوغلے، دورخے اور علاقی ہوتے ہیں خلقت ہی جھوجھری ہو گئی تو کیا اعتبار؟ نہ عورت نہ مرد دونوں کی گرد۔ ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا کہ اس سے زیادہ انیس کا کوئی ہمدرد ہی نہیں۔ حقیقت میں پوچھو تو ساری اس کے پر چانے کی باتیں تھیں وہ اپنی کارگزاری دکھاتا یا وہ انسانی شرافت جو اس میں تھی بھی نہیں۔ لیکن انیس کو اتنا سہارا بھی غنیمت تھا۔ وہ اس کی ظاہرداری کو بھی شکر ادیتی تو اس کا کیا جاتا اپنا ہی کچھ بگاڑتی اسلئے عجب گومگو میں پڑ گئی۔ نہ اقرار کئے بنتی تھی نہ انکار کئے۔ چھٹکارا دونوں صورتوں میں نظر نہ آتا تھا۔

ادریسی نے پھر سمجھایا کہ "اگر اپنے شوہر سے جلد ملنا چاہتی ہو، تو میرا کہا مانو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر طرح سے محفوظ رہو گی۔ اس کے بعد تمہاری رہائی ہے۔" انیس بیقراری سی ہو گئی۔ اس نے منہ اٹھا کر پوچھا "کیا میں احمد کے پاس بھیج دی جاؤں گی؟ سچ کہتے ہو؟ مجھے میرے گھر پہنچا دو گے؟" خواجہ سرا بھی باوجود سنگدل ہونیکے انیس کی معصومیت سے پسیج گیا تھا۔ وہ جواب کیلئے کچھ سوچنے لگا۔ اتنے میں سامنے کا پردہ اٹھا اور خلیفہ اندر آیا۔ اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلہ سے ایک قوی ہیکل نیم برہنہ حبشی تیغہ کندھے پر رکھے آنکھوں سے خون برساتا ہوا چلا آرہا تھا۔ اس ہیبت ناک شیدی کی سارے بغداد میں دھوم تھی۔ لوگ اسے مسرور جلاد کہتے تھے۔ "برعکس نہند نام زنگی کافور، کام جلادی اور نام مسرور۔ یہ بھی ایک استبدادیت کا مظاہرہ ہے۔

خلیفہ انیس کی طرف غصہ سے بڑھا۔ ادریسی نظروں کے سامنے سے ہٹ گیا تھا مسرور جلاد پردے کی اوٹ میں اور اس کی چمکتی تلوار پردہ سے باہر تھی۔ خلیفہ کرخت آواز میں بولا۔ "مغرور

چھوکری! کھڑی ہو! یا میرے حکم کے سامنے سر جھکانا منظور ہے یا جلاد کی تلوار کی طرف اشارہ کرکے، اس تیغ کے نیچے؟" ایسے موقع پر ثابت قدم رہنا کارے دارد۔ خدا پر کامل بھروسہ کے بغیر ممکن نہیں۔ انیس عورت ذات پھر مجازی محبت کی ماری ہوئی۔ لڑکھڑا گئی۔ جان کے خوف نے سب کچھ بھلا دیا۔ کچھ یہ خیال بھی تھا کہ شاید خلیفہ کو اپنی ضد پوری کرکے رحم آجائے اور وہ چھوڑ دے۔ بہر حال وہ ناچنے کیلئے رضامند ہو گئی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں کو باندھ کر عرض کیا "امیر المومنین کی اگر یہی مرضی ہے تو لونڈی کو کیا عذر؟"

انیس کو رقص کے لئے آمادہ دیکھ کر خلیفہ کا طیش عیش سے بدل گیا۔ جلاد اور اس کی تلوار آنکھوں کے آگے سے غائب ہو گئی۔ اب انیس اور خلیفہ دونوں پھر تنہا تھے۔ خلیفہ نے حکم دیا "اچھا ناچو!" انیس مجبور تھی ناچی مگر سوگوارانہ رقص۔ نہ تو پاؤں قابو میں نہ دل پر اختیار۔ ناچ کیا خاک تھا۔ چند مذبوحی حرکتیں تھیں جو اس نے رقص کے نام سے کیں۔ تاہم خلیفہ کے لئے انیس کی بے حجابیاں ہی بہت تھیں۔ گناہ حسن کی پیشوائی کو آپہنچے۔ شیطان نے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ انیس نے نظروں سے تاڑ لیا کہ خلیفہ کی نیت بگڑ گئی۔ کیا کرتی؟ نہ مرنے کی فرصت نہ مارنے کا وقت۔ خدا کے سوا کس سے مدد مانگتی اور اس کے سوا مددگار بھی کون تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر بے تکلف ایک عجیب لب و لہجہ میں قرآن کریم کی یکے بعد دیگرے دو آیتیں پڑھیں جن کا مطلب یہ تھا "اللہ کی حدود توڑنے والے شیطان کے غلام عنقریب دوزخ کا ایندھن بننے والے ہیں" اور "جو لوگ خواہشات نفسانی سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں ان کا ٹھکانہ یقیناً جنت ہے۔"

خلیفہ کچھ بھی سہی اسلام کا فرزند اور مسلمانوں کا سیاسی رہنما تھا۔ کلام الٰہی سنتے ہی کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ چہرے کی رنگت اڑ گئی۔ خوفِ الٰہی سے کانپنے لگا۔ چند منٹ کے بعد اس نے چہرہ پر ہاتھ پھیرا اور یہ کہتا ہوا کہ "اللہ نے آج مجھ کو جہنم کے لپکتے ہوئے شعلوں سے بچا لیا" سیدھا ایوانِ خلافت کی طرف روانہ ہوا۔

آٹھواں باب

انیس جلیس تو اس کشمکش میں تھی۔ احمد کی سنو۔ تھوڑی دیر تو اس پر بخار کی سی حالت طاری رہی۔ جتنے ہاتھ پاؤں مارے گئے مارے اس کے بعد وہ آندھی کے درخت کی طرح گر پڑا خواب و خورحرام ہو گیا۔ پڑا پڑا روتا یا اپنی تقدیر پہ ہنستا۔ دولتمند تھا اور فیاض۔ بامروت۔ احسان کرنے والا۔ ایسے شخص پر کوئی مصیبت آئے اور کوئی نہ پوچھے۔ جانی۔ نانی اور زبانی ہر قسم کے دوست جمع ہو گئے۔ اور اپنے اپنے درجہ کے مطابق سب نے حق دوستی ادا کیا۔ شہر کے کھوجی۔ جاسوسی کے ماہر۔ آسمان میں تھگلی لگانے والی مشہور کٹنیاں۔ جتنے بدمعاش بڑے بڑے انعامات کا لالچ دے کر لگائے۔ اور ان میں سے یک یک زمین کا گز بن گیا۔ مگر انیس تک کسی کا گزر نہ ہوا۔ امید ہوتی ہے تو اضطراب بھی ہوتا ہے۔ دوسرے دن جب ہر طرف سے اس کو مایوسی ہو گئی تو وہ ایک مردہ تھا۔ انیس کی جدائی کا صدمہ اس پر ایسا غالب ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو رہے نہ لب پر آہ۔ خاموش ایک ایک کی شکل دیکھتا۔

یہ سچ ہے کہ پولس کی مدد بے سود رہتی اور اس کی دوسری کوششیں بھی ناکام ثابت ہوئیں مگر بغداد کی گلی گلی اور کوچے کوچے میں اس ڈکیتی کا چرچا ہو گیا۔ بچہ بچہ کی زبان پر یہی افسانہ تھا۔ ادریسی اور خلیفہ بھی بے خبر نہ تھے۔ ان کے کانوں تک بھی یہ باتیں دن میں بیسیوں مرتبہ نئے نئے قالب میں ڈھل کر پہنچتیں۔ سو دشمن سو دوست۔ خلافت کا نازک زمانہ جس کے رتبے میں سوا اُن کو سوا مشکل ہے وقت کی بات تھی ہو چکی۔ انہیں بدنامی کا ڈر ہوا۔ چاہتے تھے جلد سے جلد

پرائی امانت کو اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ مگر چوری آسان ہے۔ چوری کے مال کو اپنے ٹھکانے پر رکھنا اور اس طرح کہ کاجل کی کوٹھڑی سے بے داغ نکل آئیں آسان نہیں۔

خلیفہ اپنے مرصع تخت پر تمکنت کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ درباری دست بستہ حاضر کہ ادریسی نے زمین خدمت کو بوسہ دے کر عرض کیا "امیر المومنین! انیس کا لمحہ بہ لمحہ بد سے بدتر حال ہوتا جا رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جان پر کھیل جائے اور حکومت کا سفید دامن سیاہ ہو۔ اس کی رہائی کے متعلق حضور توجہ فرمائیں۔" خلیفہ نے کہا "مجھے خود قبل اس کے کہ وہ تنگ آ کر کوئی بری حرکت کر بیٹھے اسکی آزادی کا خیال ہے۔ لیکن ...... اچھا تم جا کر اپنے طور پر یہ معلوم کرو کہ وہ گھر پہنچ کر احمد سے کیا کہے گی۔ کچھ ایسا سبق پڑھاؤ کہ ماہدولت پر کوئی حرف نہ آئے اور وہ بغیر احمد کی بدگمانی کے اس کے ساتھ رہے۔" خلیفہ کا ایما پاتے ہی ادریسی انیس کے پاس گیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگا تم دیکھتی ہو کہ ابتدا سے میری ہمدردی برابر تمہارے شریک حال ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ اگر میرے اقتدار میں ہوتا تو نہ یہاں تم آتیں اور نہ مجھ کو تم سے شرمندگی ہوتی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں تم سے جھوٹا نہیں بنا۔ انیس گھبرا کر" تو کیا میں آزاد کر دی جاؤں گی؟"

ادریسی۔ ہاں۔ میں نے امیر المومنین سے عرض معروض کر کے تمہاری آزادی کا حکم لے لیا ہے۔ تم بہت جلد عزت و احترام کے ساتھ اپنے گھر بھجوا دی جاؤ گی۔

انیس۔ کب؟

ادریسی۔ جب تم جانا چاہو گی۔ مگر ایک بات تو بتاؤ۔ تم احمد سے ملو گی تو کیا کہو گی۔ اس کا پہلا سوال یہی ہو گا کہ کہاں رہیں اور کیا بیتی؟

انیس۔ کہنا کیا ہے؟ جو واقعات گزرے ہیں سچ سچ بیان کر کے اس کے قدموں پر سر جھکا دوں گی اور کوشش کروں گی کہ وہ مجھے بے قصور یقین کرے۔ اس کے بعد ؎

اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

ادریسی۔ تمہیں یقین ہے کہ تمہارے شوہر جیسا بدگمانیوں کا پتلا۔ سوئی کا پھاوڑا بنانے والا

تمہاری رام کہانی کو سچ سمجھے گا اور تم معاف کر دی جاؤ گی؟

انیس۔ مجھے تو یقین ہے کہ وہ میرے بیان کو جھوٹا نہیں جانے گا اور پھر معاف کرنے میں کیا حجت رہی؟ آخر میری کیا خطا؟

ادریسی۔ بے شک! تمہاری خطا نہیں۔ اور ممکن ہے کہ وہ تم کو معاف بھی کر دے۔ لیکن تمہارے قصے کو سچ سمجھے یہ مشتبہ ہے۔

انیس۔ (حیرت سے) کیا کہا؟ احمد میرا یقین نہیں کرے گا؟

ادریسی۔ اس کی کوشش تو یہی ہوگی کہ جو کچھ تم کہو مان لے۔ مگر توہمات تمہارے اور اس کے درمیان حائل ہو جائیں گے۔ محبت اس طرح بیکار ہو جائے گی جیسے زنگ سے لوہا، اور کسیاؤ سے تانبہ۔

انیس۔ تم کو خدا کی سنوار! تمہاری عجیب منطق اور ہر بات پر جرح سے تو میری پریشانی اور بڑھ گئی۔ تمہیں تو چاہیے تھا کہ اگر میں کسی شبہ میں پڑتی تو اسے دور کرتے۔ ایسی صلاح دیتے کہ گزشتہ کی زندگی سے آئندہ بہتر گزرتی۔ تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو کہ اُلٹا گھر جانے کا خوف میرے دل میں بیٹھ جائے۔ اپنے شوہر کو اپنے سے برگشتہ سمجھ لوں۔ کیا خوب! اللہ تم کو نیکی دے۔ کہیں میری بربادی کا تو کوئی منصوبہ نہیں کر رہے؟

ادریسی۔ نیکی برباد گناہ لازم! میں تمہاری عزت و آبرو، دین و دنیا بنے رہنے کی دعائیں مانگوں اور تم مجھے کوسو۔ میری دردمندی کا اچھا صلہ دیا۔ جو شخص تمہارے حسن و جمال کا مداح، تمہاری قابلیت، تمہارے کمالات کا معترف اور تمہاری آزادی کے لئے اپنی جان لڑا دے۔ اس پر ایسی بدگمانی۔ تم نے تو ایک قلم میرے تمام جذبات پر خاک ڈال دی۔

مختصر یہ کہ ادریسی نے اپنی لسانی اور لفاظی سے ایسے چکر دیے کہ آخر وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئی "اچھا تو میں احمد سے کیا کہوں"

ادریسی۔ ہاں یہ تمہیں پوچھنا چاہیے۔ دیکھو بہت سے مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں

سچائی زہر کا کام دیتی ہے۔ تقیہ کا مسئلہ تو تمہیں معلوم ہوگا؟ سنا نہیں۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔

انیس۔ اچھا اپنا نظریہ بے خبر فرمائیے؟

ادریسی اس کی پشت کے پیچھے بیٹھ گیا اور نہایت سنجیدگی سے کہنا شروع کیا "تم یوں کہنا کہ وہ سائیس اور دربان یہ دونوں شخص جن کو تم ادنیٰ درجہ کے آدمی سمجھ کر بل لائے تھے دراصل ان میں بھیس بدلے ہوئے ایک خلیفہ حمزہ اور دوسرا ادریسی وزیر تھا۔ خلیفہ اپنے دارالخلافہ کے ایک معزز جوہری کی خلاف شرع بیباکی اور جسارت کو دیکھ کر کہ وہ اپنی بیوی کو غیر مردوں کے سامنے نچواتا ہے، بہت برہم ہوا۔ اس نے ٹھان لی کہ ایسے بے حیا کو صبح ہونے سے پہلے قتل کرا دے۔ لیکن وزیر نے اس تجویز کی مخالفت کی اور سمجھایا کہ احمد کے لئے سزائے موت سے زیادہ تکلیف دہ یہ چیز ہے کہ اسکو اپنی چاہیتی بیوی کے فراق کی اذیت دی جائے۔ خلیفہ کو یہ مشورہ پسند آیا اور میں نشاط باغ کی بارہ دری میں گرفتار کر کے پہنچا دی گئی۔ مجھے تمہاری مفارقت کس طرح گوارا ہوتی۔ دن رات پڑی روتی اور تمہاری خطا معاف کرنے کی التجا کرتی۔ جب میرا بہت زیادہ برا حال ہوا اور خلیفہ کو یہ خبر پہنچی کہ اگر دو چار دن اور میں مقید رہی تو یقینی تڑپتے تڑپتے جان دے دوں گی۔ ادھر تمہاری نازک حالت سنی۔ خلیفہ کے دل میں خدا نے رحم ڈالا۔ اسے ترس آیا اور اس شرط پر میری رہائی ٹھہری کہ میں وعدہ کروں کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ ہوگی اور تم کو بھی سختی سے اس بیہودہ عادت کے ترک کرنے پر مجبور کروں۔ اور یہ خلیفہ ہمارے افعال کی خبر رکھے گا۔ اس نے جتا دیا ہے اگر کبھی اس قسم کی کوئی اطلاع مجھے پہنچی تو ایسی سخت سزا دوں گا کہ بغداد میں یادگار رہے گی۔"

انیس بغور یہ باتیں سنا کی۔ آخر میں ایک لمبا سانس لے کر صرف اتنا کہا "بہت بہتر اللہ میری زبان کو جو محبت کی تابع ہے تمہاری ہدایت کے مطابق بولنے کی طاقت دے" ادریسی نے پھر ایک مرتبہ دلائل کے ساتھ سمجھایا اور چونکہ رات ہو رہی تھی، خدا حافظ کہہ چلا گیا۔ انیس کے لئے یہ رات عید کی رات تھی۔ اس نے احمد کے ملنے کی خوشی میں گھڑیاں گن گن کر گزاریں۔ تاہم

قسم قسم کے تصورات، رنگ برنگ کے خیالات۔ طرح طرح کی باتیں۔ عجیب عجیب توہمات آتے اور جاتے رہے۔ دل خوش کن بھی اور المناک بھی۔ کبھی احمد کی صورت، محبت کی تصویر ہنستی ہوئی خوشنما نظر آتی اور کبھی مکدّر، بھیانک۔

صبح، تارے ابھی جھلملا رہے تھے، نماز کا وقت باقی تھا کہ وہی چالیس نقاب پوش جنھوں نے احمد کی محلسرا پر دن دہاڑے ڈاکہ مارا تھا اور انیس کو مع اس کی خوابگاہ کے ساز و سامان کے اٹھا لائے تھے۔ شاہی عیش باغ میں آئے، اور اسی طرح پھر لے چلے لیکن اس دن وہ لٹیرے معلوم ہوتے تھے اور آج براتی۔ انیس آرام اور احترام کے ساتھ احمد کے گھر پہنچ گئی۔ پابدست دگرے دست بدست دگرے نہیں۔ پالکی میں چار حبشی غلاموں کے کندھوں پر۔ پالکی صحن میں رکھ کر چالیس کے چالیس نقاب پوش خاموش رخصت ہوئے۔ احمد یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا۔ حیرت سے حیرت تھی کہ پالکی کا زربفتی پردہ اٹھا اور انیس نکل کر باہر آئی۔ اسے بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی طلسم ٹوٹا۔ حیرت، خوشی، ایک دوسرے کی طرف بڑھتا اور ٹھٹک جاتا۔ چند قدم کا فاصلہ کئی سانسوں میں طے ہوا۔ جانوں پر صدمے اٹھائے تھے۔ مایوسیوں کے بعد خدا نے ملایا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں۔ سنسناتے ہوئے بدن۔ دھڑکتے ہوئے دل۔ جب قریب ہوئے تو دونوں کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ کھڑے نہ رہ سکے۔ وہیں زمین پر غش کھا کر گر پڑے۔ کنیزیں پردوں کے پیچھے سے جھانک رہی تھیں۔ یہ دیکھتے ہی دوڑیں۔ ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں۔ تھوڑی دیر میں حواس ٹھیک ہوئے۔ وہاں سے اٹھے۔ اندر جا کر بیٹھے۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی سرگزشت سنائی۔

بلبل کی داستان میں تو چند نالوں اور خزاں رسیدہ شاخوں پر بیٹھ کر بہار کی یاد میں پر نوچنے کے سوا کیا رکھا ہے۔ قصہ تو گل کا ہے جس پر ایک ہی جھونکے میں قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ احمد نے اپنی زارنالیاں سنا کر جو انیس کی کہانی سنی زرد ہو گیا۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیر تک اپنی حماقت پر افسوس کرتا رہا کہ اس نے کس طرح اپنی اور اپنی بیوی کی جان کو

خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ اُسے ان دونوں اجنبیوں کی طرز نشست و برخاست سے شک تو گزرا تھا کہ جس بھیس میں یہ ہیں ان کا اصلی نہیں۔ لیکن اس کے سان گمان میں یہ تھا کہ خلیفہ اور وزیر بھی بھیس بدل میں ہو سکتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس واقعہ کے بعد یہ سمجھا کہ کوئی جیب ساز ڈاکو تھے اور دیر سویر انیس کی رہائی کے لئے کسی بڑی رقم کا مطالبہ کریں گے۔ وہ تیار تھا کہ کوئی کچھ خبر تو لائے ماس نے دینا ۔دن کی بھری ہوئی تھیلیاں۔ دکان کا سارا مال اکٹھا کر لیا تھا تاکہ وقت پر کسی کا ہاتھ نہ دیکھنا پڑے بلکہ ادھر اُدھر قرض میں جو رقمیں پھیلی ہوئی تھیں ان کی فراہمی کے لئے اس کے کارندے برابر دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ انیس کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے واسطے احمد نے یہ سب سامان دکھائے

ضمناً احمد کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس خوزیرنہ افسانہ کے انسانی بنانے میں وزیر نے بڑا حصہ لیا ہے اور ادریسی نے انیس کو پٹی بھی یہی پڑھائی تھی کہ اس کی اپنی ہستی نمودار رہے چنانچہ احمد کو یقین ہو گیا کہ اگر ادریسی کی ذات درمیان نہ ہوتی تو انیس کی رہائی اور میری زندگی دشوار تھی وہ بمصداق قول جزاء الاحسان الا الاحسان تھوڑے تامل کے بعد دو اونٹوں پر اشرفیاں اور قسم قسم کے بیش بہا تحفے لاد ادریسی کا شکریہ ادا کرنے جا پہنچا۔ وزیر اپنے مکان ہی پر تھا۔ احمد سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملا۔ ہدیہ قبول کیا۔ خاطر و مدارات کی اور رخصت کرتے وقت بڑی ہمدردی کے ساتھ سمجھایا کہ "تم نے غلطی تو سخت کی تھی، خلیفہ بے حد مشتعل ہو گیا تھا لیکن اللہ نے رحم کیا۔ خیر گزشت آنچہ گزشت۔ آیندہ پوری احتیاط رکھنا۔ بھولے سے بھی ایسی حرکت نہ ہو۔ ورنہ خلیفہ کے غصہ کی آگ کو نہ اس بیگناہ کے آنسو ٹھنڈا کر سکیں گے نہ میری منت اور خوشامد۔" احمد نے انتہائی عقیدت کے ساتھ ادریسی کے عبا کے دامن کو بوسہ دیا اور قسم کھائی کہ "پھر ایسی کوئی لغو حرکت سرزد نہیں ہوگی" ادریسی نے پھر کہا "خواجہ احمد یاد رکھو اب تمہیں اس ناگوار واقعہ کو بالکل بھلا دینا چاہئے تمہارے لئے مناسب ہے کہ اپنی بیوی کے سامنے کبھی اشارے اور کنائے میں بھی ذکر نہ آئے تلافی مافات کی بھی ضرورت نہیں۔ خلیفہ نے یہ سزا دے کر جرم کو منسوخ اور معاملہ کو ختم کر دیا ہے۔" اس کے بعد احمد نے درخواست کی کہ "ہم دونوں میاں بیوی اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھیں گے۔

"اگر آپ کسی دن غریب خانہ کو زینت بخشیں اور اپنی مہربانی سے ہمیں شاد کام کریں۔" وزیر نے وعدہ کیا کہ "اگر شاہ کی مرضی اس کے خلاف نہیں تو ضرور ایک نہ ایک دن آؤں گا اور مجھے تم دونوں کو اپنے گھر میں سکون سے ساتھ رہتے ہوئے دیکھ کر واقعی بڑی خوشی ہوگی۔"

محبت کی افراط یونہی بلائے جان ہوتی ہے۔ پھر اس پر اگر محبت کرنے والے کا دماغ بہ لمحہ اُپج کی لینے لگے۔ خیالات میں اُتو نے انڈے بچے دے دے تو سمجھو کہ زندگی وبال میں پھنس گئی۔ احمد کا یہی حال تھا۔ اس کے تصورات بیٹھے بیٹھے ہی نئے نئے۔ وہ ہزار چاہتا کہ آرام و دلجمعی سے بسر لے لیکن اپنی عادت اور فطرت سے مجبور تھا۔ کچھ دن تو چپ رہا۔ منہ سے کسی طرح کی بھاپ نہ نکالی۔ اندر ہی اندر گھٹتا رہا۔ آخر ایک دن صبر نہ ہو سکا۔ قلب کی وحشت زبان پر آ ہی گئی۔ انیس کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ "انیس! تم کہو گی تو سہی کہ تجھے پھر سودا اچھلا۔ پرانی بیماری نے پھر عود کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ "ان بیکار باتوں سے مزہ لطف کا جاتا ہے۔" مگر سب تو یہی" اگر خاموش رہتا ہوں کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

انیس۔ (حیرت سے احمد کا منہ دیکھ کر) کیا بات ہے؟ کوئی نیا وہم پیدا ہوا!؟

احمد۔ وہم نہیں میں اپنے دل کا کوئی بھید تم سے چھپانا نہیں چاہتا۔

انیس۔ میں تو جانتی تھی کہ تمہارے سینہ میں میرا اور میرے سینہ میں تمہارا دل ہے۔ کیا کوئی راز ایسا بھی ہے جو تم نے الگ رکھ چھوڑا ہے؟

احمد۔ نہیں یہ چیز نہیں۔ پچھلے دنوں میں جب تم بہت بچھڑ گئی تھیں۔ مجھ کو طرح طرح کے خیال آتے تھے۔ میں ضرور سمجھتا ہوں کہ وہ تم پر بھی ظاہر کر دوں۔

انیس۔ چھوڑو بھی۔ وہ کوئی اچھے خیال تو ہوں گے ہی نہیں۔ اُن کے ذکر سے کیا فائدہ۔ مزے مزے کی باتیں کرو۔

احمد۔ لیکن فرقت کی کہانی جو مکمل نہیں ہوتی۔ سنو تو

انیس۔ آپ کی خوشی۔ اچھا کہیے؟

احمد۔ میرا دماغ بہت ہی برے برے خواب دیکھنے لگا تھا۔ میرے دل پر نہایت صبر آزما امکانات کی یورش تھی۔ کبھی میں خیال کرتا کہ شہر کے اوباشوں نے تمہاری خوبصورتی کے لئے تمہیں اغوا کیا ہے اور اب وہ اپنا مطلب، حسن کرنے کو تم پر جبر و تشدد کر رہے ہوں گے۔ یا تو خوشامد اور لجاجت سے تمہاری عنایت کے متمنی ہوں گے۔ کبھی یہ گمان ہوتا کہ جو تمہیں لے گئے ہیں اگر اپنے منصوبوں میں کامیاب ہوئے اور تم ان کے جال میں پھنسی رہ گئیں تو میں کیا کروں گا۔

انیس۔ (احمد کی طرف دیکھ کر) تو کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں تھا؟ عورت کو دنیا جتنی حقیر سمجھتی ہے فطرتاً وہ اتنی حقیر نہیں۔ یہ جب کسی سے الفت کا رشتہ جوڑ لیتی ہے۔ جس کی ہو رہتی ہے۔ پھر نہیں توڑتی۔ نہیں چھوڑتی۔ اور موت بھی اسے نہیں چھڑا سکتی۔ ہندوستان کی رسم ستی ہے؟ مردہ شوہر کے ساتھ اس کی زندہ بیوی بھی خوشی خوشی ستی ہو جاتی ہے۔

احمد متاثر تو بہت ہوا مگر وہ اپنی خصلت سے مجبور تھا جو اس کے دل میں تھا بغیر کہے کس طرح رہتا۔ زبردستی مسکرایا تاکہ انیس ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہ دے اور بولا "یہ تم نے کیونکر سمجھ لیا؟ بھروسہ نہ ہونے کے کیا معنی۔ تم سمجھی نہیں۔ اگر کوئی پردیسی۔ اجنبی۔ نووارد اپنے کسی شہری دوست کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بغداد کے بازاروں میں پھر رہا ہو اور یکایک آدمیوں کی ریل پیل میں بچھڑ جائے تو اسی وقت نہیں تھوڑی دیر بعد سہی یا تو وہ وہیں کہیں ادھر ادھر اپنے دوست کو ڈھونڈ لے گا ورنہ پوچھتے پوچھتے صبح کا بھولا شام تک اس کے گھر پہنچنے میں تو شک ہی نہیں۔ لیکن جب ایک خضر جیسا مقدس اور معتبر رہبر کسی مسافروں کی ایک لق و دق صحرا میں رہنمائی کرتے کرتے آنکھوں ہی آنکھوں میں الوپ جائے تو غریب مسافر کہاں کا رہا؟ منزل مقصود پر پہنچنا تو کیا عمر بھر بھٹکا ہی کرے گا۔ ایسی صورت میں حضرت خضر کے بدلے کوئی غول بیابانی آکر اس مایوس زندگی کی دستگیری کرے اور منزل کی خوشخبری سنائے تو ظاہر ہے کہ اس کے حق میں تو وہی خضر ٹھیرا۔ اور مسافر کو اس کا ممنون احسان ہونا پڑے گا۔

انیس حیران تھی کہ خدا خیر کرے کوئی نیا جنون سوار ہوا اور ٹوکنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ احمد

بولا "ابھی تم کچھ نہ کہو۔ پہلے میری پوری بات سن لو۔ ہوں تو انیس تم نے میرے سبب تو وہ راستہ اختیار کیا جسے کوئی نہیں جانتا۔ حیرت کی وادی میں ہم دونوں بھٹک رہے ہیں۔ صرف محبت کا ستارہ ہماری رہبری کر رہا ہے۔ دن کی روشنی میں یادات کو گرد و غبار سے جب وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اپنے تخیل کی تاریکیوں میں ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں تو تم کو بہت صدمہ ہوتا ہے تمہیں نہ خضر کی تلاش ہوتی ہے نہ غول بیابانی کے چکر میں آتی ہو۔ تمہاری آنکھیں اسی ستارے کو ڈھونڈتی ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ میں نے تمہیں اپنے سوا ہر چیز سے محروم کر دیا ہے۔ تمہاری منزل مقصود صرف میں ہوں۔ دراس کا رہنما محبت کا ستارہ۔ میرا تمہیں اس طرح مقید کرنے سے کیا مقصد تھا؟ یہی کہ تمہاری عقیدت صرف مجھ سے ہی رہے۔ میری خوشی اور میری رضا جوئی تمہارا قانون بن جائے لہذا جس وقت تم مجھ سے جدا کر دی گئیں اور میں تم سے چھین لیا گیا۔ تمہارے دل میں میری ہی یاد تمہاری آنکھوں میں میرا ہی تصور رہا۔ تم باوجود خلیفہ کے محل میں ہونے کے اپنے آپ کو تنہا میری آغوش ہی میں سمجھتی رہیں۔ اور تمہیں میری ہی رہبری کا انتظار رہا۔ کاش میں مدد کر سکتا اور میرے ہاتھوں سے تم منزل پر پہنچتیں۔ لیکن میرے پاؤں میں کانٹے چبھے ہوئے تھے۔ مجھ پر خوف طاری تھا کانٹے، پڑوسیوں کے اور خوف اپنی ذات اور تمہاری محبت کا...... اب کہو کیا کہتی ہو؟" انیس نے احمد کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس کے دل میں چور تھا۔ ادریسی کے ڈر کے مارے وہ احمد سے اصلی سعید کی بات چھپانا چاہتی تھی۔ مگر محبت کے مقابلہ میں ضبط و احتیاط نے ہمیشہ شکست کھائی ہے۔ بہرحال وہ کہہ کر ٹال گئی کہ آپ کی بدگمانیاں لاعلاج ہیں۔ میں نے تو جو کچھ مجھ پر گزر رہا تھا رتی رتی آپ کو سنا دیا۔

عورت، شوہر کی پرستار اور محبت کی متوالی، آخر ایک دن جوش میں آ کر کھل پڑی۔ باتوں باتوں میں اس نے اپنا سینہ ہلکا کرنا چاہا۔ کہنے لگی "جب ہم ایک دوسرے سے جدا ایک دوسرے کی صورت کو ترس رہے تھے، آپ جانتے ہیں کہ مجھے کیا صرف آپ ہی کی دھن رہی۔ میں نے آپ کے توہمات میں حصہ نہیں لیا؟ میں نے اس تنہائی اور مصیبت کے زمانہ میں کئی مرتبہ دیر دیر تک

اجنبی لوگوں کے سامنے رقص کرنے کے مسئلہ پر غور کیا اور اب میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کیا میری وہ بے پردگی اور نمائش اس خوشگوار واقعہ کی داغ بیل اور تمہید نہ تھی؟" اگرچہ انیس نے اس سلسلہ میں بہت کچھ کہہ دیا لیکن مشتبہ کرنے والے پہلو بچاتے ہوئے ادریسی کے بتائے ہوئے طریقہ پر وہ ایسے لطیف انداز سے کہ احمد سنتے سنتے محو ہو گیا۔ اسے ہوں ہاں کرنے تک کا ہوش نہ رہا۔

انیس کی شیریں بیانی اس حد تک پہنچ گئی کہ احمد اپنے گمانوں سے ہٹ کر محبت کی دنیا میں بس گیا تو اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ جب اپنی راگنی کے آگے آپ نے ساز کے پردوں پر خیال نہ کیا کہ کہاں جا رہے ہیں تو راگ سننے کے بعد آپ کب مطمئن ہوں گے۔ شاید آپ نے میری موسیقی سے یہ سمجھا ہے کہ میں دوسروں کے ہاتھوں میں بھی رقصاں رہی جس طرح آپ کیلئے ہوں۔ گو آپ میرے بیان کو اپنی محبت کی وجہ سے مان لیں لیکن دوسرا کوئی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور ایسی صورتوں میں زبان خلق کا زیادہ اعتبار کیا جاتا ہے۔"

احمد۔ (قدرے تامل کے بعد) انیس! کیا کہہ رہی ہو؟ تمہارے اندر صداقت اور دیانت اس قدر بھری ہوئی ہے جیسے بادل میں گرج، بجلی میں چمک جس کی آواز اور روشنی زمین سے آسمان تک فضا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے تم نے واسطہ ہے یا دنیا سے۔ سب ظاہر دیکھتے ہیں اور میں باطن۔ میری نگاہوں میں تمہارا حال ہے۔ مستقبل اور غیب کا جاننے والا خدا کے سوا کون ہو سکتا ہے؟

انیس۔ (پیچھے کی طرف گردن ڈال کر) تو میں آپ سے سچ سچ کہہ دوں؟

احمد کے چہرہ پر یہ فقرہ سنتے ہی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

انیس۔ (اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) لیکن آپ کو تو سب معلوم ہے۔

اور اس کی آواز بدل گئی۔ سارے شکوک یک دفعہ ہی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئے اور اس کا گلا سا گھٹ گیا۔ اس نے لاکھ ٹالنا چاہا۔ کیا ہو سکتا تھا۔ طبیعت کی ذرا سی کمزوری نے طوفان مچا دیا۔ ادریسی نے سچ کہا تھا کہ محبت کے رستوں میں بدگمانیوں کی گرہیں ہوتی ہیں انہیں

کھونا نہیں چاہتے۔

حُسن کی دل آویزیوں اور محبت کی گرم جوشیوں نے تھمی ہوئی آگ کو بجھا دیا۔ احمد کے خیالات پر انیس کی صورت غالب رہی اور وہ سودا دب کر رہ گیا بلکہ اس کے بعد بھی نہ شوہر نے کبھی نہ بیوی نے پھر ایسی غلطی کی۔ انیس شوہر کا دل بہلانے اور احمد بیوی کے ناز و نیاز میں مصروف رہنے لگا۔ احمد کی دلچسپیاں انیس کے رقص سے زیادہ وابستہ تھیں۔ اس لئے وہ روز صبح و شام اس کیلئے رقص کرتی مگر زبان سے کسی کیفیت کا اظہار نہ کرتی۔ اسے یقین تھا کہ وہ بار احمد پر فتح پاتی رہے گی۔ نہ پتے دن کبھی دو سیدہ پوشاک پہنتی کبھی سبز کبھی سرخ کبھی نیلگوں۔ اس نے بھاری بھاری زربفت اور کمخواب کی پوشش سے اپنے کندھوں کو سبکدوش کر دیا تھا۔ اب اس کے جسم پر پھول سے ہلکے پھلکے کپڑے ہوتے۔ اس کی بناوٹ سادگی میں بدل گئی تھی۔ اس نے اپنے سارے بھید دونوں میں ملا دیے تھے۔

شوقین امراء بھی اپنے گھروں میں حُسن پرستی، ہوس رانی اور اپنی دلچسپیوں کی خاطر کیا کچھ نہیں کرتے۔ بیسیوں نکاح کرتے ہیں۔ طوائفوں کی دن رات آمد و رفت رہتی ہے۔ اس دور کے بغداد کی حالت کیا پوچھتے ہو جب کہ حُسن کی خرید و فروخت کا بازار گرم تھا۔ ہر دولتمند کے محل میں حسین لونڈیوں کی بھرمار تھی۔ اور یہ باتیں کچھ عیاش اور جوانوں پر منحصر نہ تھیں۔ رسم و رواج ہی یہ تھے۔ مگر احمد نے باوجود عیش کے عادی، نوجوان اور مالدار ہونے کے اس مطلب کیلئے کبھی لونڈیاں نہیں خریدیں۔ وہ انیس کی موجودگی میں اس قسم کی تمام تفریحات سے بے نیاز تھا۔ بعض طبیعتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ دو متضاد جذبوں کی مالک ایک ہی وقت میں دو مختلف کمزوریوں کی غلام۔ ایک آنکھ آسمان پر ایک زمین پر۔ اور دونوں کا مرکز ایک۔ مرکز ایک اور نگاہیں منتشر۔ احمد کے مزاج کی بھی یہی کیفیت تھی۔ چند روز بعد پھر اسے شیطان نے انگلی دکھائی یکرنگی میں تنوع کا خیال پیدا ہوا۔

انیس کی سادہ شوخیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوتے احمد کو ایک نئی سوجھی۔ وہ اپنی

بیوی کی ہر چیز کا بلا شرکت غیرے مالک تو تھا ہی۔ خوف تھا تو صرف خلیفہ کی تہدید کا۔ اپنی مسرتوں میں کسی کو شریک کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس لئے اس نے اپنی پرانی بیماری کا ایک انوکھا علاج نکالا یعنی خود اجنبی بن کر انیس کے جمال و کمال کا تماشہ دیکھے۔ اس سے زیادہ بے لاگ کیا تجویز ہو سکتی ہے۔ خود تماشہ و خود تماشائی۔ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ لیکن یہ خیال پورا کیونکر ہو؟ ضرورت تھی کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا اجنبی اور ندیدہ مہمان سمجھے جسے اچھی صورتوں کے دیکھنے کا شوق، تجسّر اور حسن سماعت اس کے گھر کھینچ لائے۔ وہ آنکھوں سے دیکھے، زبان سے تعریف کرے اور پھر ایک دم احمد بھی بن جائے تاکہ اپنی فرضی شخصیت کے استعجاب اور بدنگاہیوں کا جائزہ لے سکے۔

اس نفسیاتی کھیل سے احمد نے یہ سمجھا تھا کہ اسے ان لوگوں کے احساسات و جذبات کا بخوبی اندازہ ہو جائے جو انیس جلیس کا رقص دیکھنے کے بعد وہ اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔ ایرانی واعظ قمر الزماں کا نظریہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جسے احمد اچھی طرح نہ سمجھ سکا گرچہ ایک وقت میں ایک شخص کا دو حیثیتیں قائم کرنا اور دونوں حیثیتوں کو الگ الگ رکھنا دشوار تھا تاہم احمد نے کئی بار یہ کھیل کھیلا۔ مگر جیسی چاہیئے اس کی تسکین نہیں ہوئی۔ وہ اجنبی نہ رہ سکا۔ اس کا گھر، اس کی بیوی، جائز تعلقات۔ تھوڑی دیر میں حدیں ٹوٹ جاتیں۔ دوسرے اس کے لئے یہ تقریباً ناممکن تھا کہ وہ عورت کو صرف فنِ مصوری کا ایک نمونہ سمجھے۔ دور ہی دور سے بیٹھا آنکھیں سینکا کرے جب کبھی وہ مہمان بنا، اور انیس نے اس کے سامنے رقص کیا۔ اُسے چند ہی منٹ کے بعد ایک حیثیت بدلنی پڑی اور حسن کی سحر کاریوں میں مبتلا ہو کر اس کے سوا کچھ نہ کر سکا کہ باصرہ و سامعہ کے بعد باقی تینوں حسوں کا بھی مزہ چکھے۔

گزشتہ واقعات کے بعد احمد اور انیس کی باتیں عموماً استعاروں میں ہوتیں، خصوصاً احمد جب کبھی اپنے شبہات میں گھر جاتا تو ضرور شاعرانہ طرز کی گفتگو کرتا۔ ایک مرتبہ سرِ شام وہ دوکان سے آکر سیدھا انیس کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

احمد۔ میں نے تمہارا ایک اور منظر بھی دیکھا ہے۔

انیس۔ (چونک کر) کیا؟

احمد۔ یہ کہ آسمان پر دوڑنے والی بجلی کی طرح تمہارے تخیلات نے امکان کی گہرائی کے ظلمت کدہ کو روشن کر دیا ہے۔ تم نے خواب کے اس دھندلے جزیرے میں مجھے چھوڑ نا چاہا جس کا تصور بھی خوفناک ہے۔ اگر خلیفہ کا قدم درمیان اور جدائی کی مصیبت سامنے نہ ہوتی تو تم اس کا حال سنتیں اور میں کہتا۔

انیس۔ (کانپ کر) میرے سرتاج!

احمد۔ ہاں۔ مجھے اب تمہاری محبت پر پورا اعتماد ہے۔ میں اپنے کو تمہارے ساتھ بالکل ایک جان اور دو قالب پاتا ہوں۔ مجھے ابھی جینے کی خواہش ہے اور جینا تمہارے بغیر ممکن نہیں۔ انیس! تم کو معلوم ہے؟

انیس۔ میرے آقا واقعی ہم "من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی" کے مصداق ہو چکے ہیں۔

احمد۔ نہیں ایک اور بات۔ میں نے اس عرصہ میں تم کو اجنبی آنکھوں سے دیکھا۔

انیس۔ (حیرت سے) یہ کیوں کر؟

احمد۔ میں اپنا آپ رقیب بنا۔ ایک تخیلی احمد کو یہاں لایا اور تمہارا ناچ غیروں کی طرح دیکھا۔

انیس۔ (پریشان ہوکر) خوب! پھر؟

احمد۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم اصل میں کیا چیز ہو؟ تمہارا حسن دوسروں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اور تمہارے رقص سے کس قسم کی خواہشیں پیدا ہو سکتی ہیں؟ لیکن میں ایک اجنبی کی حیثیت میں تم سے خاطر خواہ متمتع نہیں ہو سکا۔ ہاں جب میں پھر اپنے اصلی روپ میں آگیا۔ اپنے آپ کو تمہارا شوہر احمد سمجھنے لگا۔ تصورات ہی کچھ اور ہو گئے۔ وہ غیر تسکین

بخش خواہش انتہائی مسرت سے بدل گئی۔

انیس۔ کیا سبب؟

احمد۔ مجھ کو یقین ہو گیا کہ صرف میں ہی تم کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہوں۔ ایک اجنبی تمہارے حسن و جمال کا کتنا ہی مداح کیوں نہو تمہارے دل پر قبضہ نہیں پا سکتا۔ اور اب میں آنکھیں بند کر کے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی فرشتہ بھی ہماری محبت پر ڈاکہ نہیں ڈال سکے گا۔

انیس۔ شکر ہے کہ آپ کی محبت نے مجھے سرخرو کیا۔

احمد۔ ہاں ہاں! اس آزمائش کے بعد اور اپنے قلب کی یہ آواز سن کر کہ تم صرف میرے لئے ہو میں یہ کہنا گوارا نہیں کرتا کہ میں نے تمہیں ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں گرفتار سمجھ کر بھی کوئی ایسا گمان کیا جس سے میری محبت کی ہتک ہو۔ اور تم نے جبر و تشدد کے باوجود اپ آپ کو ان کے حوالہ کر دیا ہوگا۔

انیس اگر آپ ایسا گمان کرتے تو کیا آپ کی محبت کی کمزوری نہ تھی؟

احمد۔ لیکن کوئی شخص گھر سے بہت دور مسافرت میں، حج پر گیا ہوا ہو۔ یا سمندر پار مصر یا مثلاً ہندوستان کا گشت لگا رہا ہے۔ تجارت کی غرض سے یا سیر و تماشہ کے لئے اور اس کی حسین بیوی اس کے ساتھ نہیں تو ایسی صورت میں وہ اس دور افتادہ سے کہہ سکتا ہے کہ بیگم! محبت میں بُعد مکانی کوئی چیز نہیں۔ تم محض تخیل سے اپنی خواہشات کی تسکین کر لیا کرو اور جو کچھ تم پر بیتے یاد رکھو، میں آؤں تو سنا دینا۔ یا فلاں فلاں آدمی تمہارے قدر دان ہیں۔ انہیں اپنے کرشموں سے لبھاتی اور مجھے کہتی رہو۔ خیال کی دنیا کو خدا آباد رکھے میں بدگمان نہیں ہوں گا اس لئے کہ تمہارا شوہر ہوں اور تم میری بیوی۔

انیس کو اپنے شوہر کی ان باتوں سے بڑی تکلیف ہوئی اور اسے سپہر حزارہ اٹھا کہ کچھ بھی ہو حقیقت پر سے پردہ اٹھا دینا چاہیے۔ اور یہی نے جن واقعات کو احمد سے چھپانے کو کہا ہے ایسا نہو خود بخود کھل جائیں اور پھر میرے بنائے کچھ نہ بنے۔ یہ ٹھان کر اس نے پوچھا "آج تم یہ

کیسی باتیں کر رہے ہو۔ سننے کے سوا میں تو کچھ بھی نہیں۔" احمد نے جواب دیا "کیسی باتیں!.... سچ پوچھو تو میں بھی نہیں سمجھ سکتا......... لیکن چونکہ ہماری محبت نے الٹی گنگا بہا کر مجھے بزدل کر دیا ہے۔ میرے خیالات میری تضحیک کر رہے ہیں۔ اس لئے مجھے ایسا کرنا چاہئے اور اسی طرح یہی عمل کرنے سے تم کو تمہاری محبت کی معراج حاصل ہو سکتی ہے۔ میری بیماری کا علاج اگر ہوگا تو بالمثل ہی ہوگا۔"

شوہر کو اپنا خدائے مجازی سمجھنے والی۔ گھر کی بی بی۔ سبک ضمیر۔ بد قسمت عورت احمد کے اس واہی تباہی خیالات کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے نیچی گردن کرکے دھیمی آواز سے آخر راز افشا کر دیا کہ "میں نے تمہارے بچاؤ کی خاطر خلیفہ کے سامنے رقص کیا تھا!" اتنا سنتے ہی احمد کے تن بدن میں پتنگے لگ گئے۔ جیسے کسی نے بارود میں آگ لگا دی۔ "لرزہ بر عضو ضعیف ہمی ریزد۔" خلیفہ کی طاقت اور انیس کی مجبوریوں کو بالائے طاق رکھ غصے میں اس کی کلائی پکڑ فرش پہ دے پٹکا اور چلا کر کہا "مکارہ! شرم نہ آئی! میری امانت میں خیانت؟" وہ تکلیف سے بے چین ہو کر چیخی "مجھے چھوڑ دو۔ ہاتھ ٹوٹا جاتا ہے۔

قتل کر ڈالو مجھے یا جرم الفت بخش دو

مگر احمد کے سر پر تو غصہ کا جن سوار تھا۔ وہ اس کی نزاکت اور واقعات پہ کیا غور کرتا۔ برابر جھٹکے دئے گیا اور کرخت آواز سے بولا "فریب کی پتلی! اب اس چہرہ کو جس کی نقاب الٹ چکی ہے میرے سامنے معصوم نہ بنا۔ صاف صاف بتا؟" انیس نے اپنے ہونٹ چبا ڈالے سر زمین پر دے دے مارا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو چھڑایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نشاط باغ کی بارہ دری کا منظر آیا۔ کبھی خلیفہ اور مسرور جلاد کی صورتیں دکھائی دیتی تھیں کبھی احمد کی تصویر۔ اس کا دل بھر آیا اور زار زار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سسکیوں کی آواز کو چھپانے کے لئے اس نے اپنے منہ پہ تکیہ ڈال لیا لیکن اس کے جسم کی جنبش اور ہچکیاں بتا رہی تھیں کہ اس کے سینہ میں طوفان برپا ہے۔

احمد کے حواس کچھ درست ہوئے اس کی آنکھوں کے آگے سے تاریکی ہٹی تو اس نے ایک گہرا سانس لیا، ور ایک طرف خاموش بیٹھ کر انیس کی طبیعت کے سکون کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد آنسوؤں نے دل کی بھڑاس نکال دی، رقت کم ہوئی، سسکیاں تھمیں تو نیس نے تکیہ کے نیچے سے اپنا منہ نکالا، آنکھیں سوجی ہوئی، چہرہ بھیگا ہوا تھا اور ہونٹ پھڑک رہے تھے وہ احمد کی طرف دیکھنے لگی۔ احمد بولا "ہاں! بیان کر، بالکل سچ سچ!" جو کچھ خلیفہ کے ہاں گزرا تھا۔ اپنی خاموشی، خلیفہ کی الزامی تقریر، رقص کے لئے اصرار، اپنا انکار۔ اس کی ناراضگی، مسرور جلاد کا آنا۔ اپنی اور اپنے شوہر کی جان کو خطرہ میں دیکھنا۔ مجبوراً رقص کرنا۔ خلیفہ کی بدمستی، کلام الٰہی کی آڑ لے کر اس کی نازیبا حرکت سے بچنا وغیرہ وغیرہ تفصیل وار سب کچھ سنا دیا۔ البتہ کہانی کا آخری حصہ یعنی ادریسی کی گفتگو دانستہ چھپا گئی۔

انیس اظہار دے رہی تھی جیسے قاضی کے روبرو کوئی مجرم اور احمد ایک ایک واقعہ کے متعلق کئی کئی سوال کرتا جاتا تھا۔ اس کے تصورات تسکین چاہتے تھے۔ اس کو جلدی تھی کہ جو کچھ گزرا ہے اس کا صحیح نقشہ کسی طرح سمجھ میں آجائے۔ کوئی تنقیح طلب بات باقی نہ رہے۔ اس لئے اس نے جا دبیجا، ضروری وغیر ضروری، اچھے برے سوالات کی بھرمار کر دی۔ مگر احمد جیسا خود پسند، بیمار دماغ کا آدمی جو اپنے خود ساختہ جذبات کا غلام بھی ہو دو چار قسم کے سوالوں کے سوا کہ "تم نے کیا کہا؟ اس نے کیا جواب دیا؟ تم کہاں کھڑی تھیں؟ وہ تم سے کتنی دور تھا؟ کیا وقت ہوگا؟ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی یا محبت؟ اور پوچھ بھی کیا سکتا۔ اس کی قابلیت اتنی ہی تھی۔ ہاں ایک سوال جسے وہ رہ رہ کر دہراتا تھا کہ "تمہارا خیال اس وقت کہاں تھا؟" اور جس کا جواب اس نے بلا تکلف ہر مرتبہ یہی دیا کہ "مجھے صرف تمہارا خیال تھا" ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر انیس میں ذرا بھی خامی ہوتی تو شاید وہ بہک جاتی۔

باتوں میں شاخیں نکلتی چلی آتی تھیں۔ بڑی رات آگئی آخر کہانی ختم ہوئی۔ انیس نے محسوس کیا کہ ضمیر پہلے کی نسبت ہلکا ہے۔ اس کے چہرہ کی پژمردگی کم ہونے لگی۔ وہ محبت

بھری نگاہوں سے احمد کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ مگر احمد نے بے پروائی سے منہ پھیر لیا اور کہا میں یہ مانتا ہوں، مجھے اس کا اقرار ہے کہ تمہاری روح کو مجھ سے بے حد علاقہ ہے، پھر بھی میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تم اتنے دن کال کی کوٹھڑی میں بند ہو کر بھی پاک وصاف رہیں؟ سچ ہے کہ میں نے تمہارے اوپر کامل فتح پائی ہے، لیکن اس شخص کو جس نے تمہیں میرے قبضہ سے نکال کر مجھے کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ کیا تمہاری غلط انداز نظروں کا بھی کوئی حصہ نہ پہنچا ہوگا؟

انیس۔ نہیں میرے آقا! بارش کے ایک قطرہ کے برابر بھی نہیں۔ آنکھیں دل کی تابع ہوتی ہیں۔ دل میں تم بسے ہوئے تھے تو نگاہیں بھی تم ہی کو تلاش کر رہی تھیں۔ کسی غیر پر کس طرح پڑتیں۔

احمد۔ (کچھ سوچ کر) اس کا ثبوت؟ کوئی دلیل؟

انیس کے دل کو ایک ٹھیس لگی۔ اس کے آنسو نکل پڑے۔ وہ نزاب اٹھی اور بولی "تم جوہری ہو ایک دفعہ کسی نگینہ کو دیکھ کر عمر بھر نہیں بھولتے۔ کیا تم نے آج تک مجھے پرکھا نہیں۔ خیر ہمارا ماضی میری وفاداری کو ثابت کرنے میں ناکافی ہے تو مجھے مہلت دیجئے کہ مستقبل میں مرتے دم تک اپنی محبت کا ثبوت پیش کر سکوں۔

احمد۔ گزشتہ کیلئے آیندہ پر کیا اعتبار۔ تلافی مافات کی یہ صورت نہیں ہو سکتی۔

انیس۔ پھر کس طرح میرے ناکردہ گناہوں کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

احمد۔ تمہیں کفارہ دینا چاہئے۔

انیس۔ تو پھر مجھے کیا کرنا ہے۔ آپ کیا کفارہ تجویز کرتے ہیں؟

احمد۔ کل صبح کو اُس بڑے قاضی کا جو دنیا کے ہر قاضی سے زیادہ انصاف کرنے والا ہے، جب پہلا دربار ختم ہوگا، بتاؤں گا۔

بحث تو ختم ہوئی، دونوں میاں بیوی اپنے اپنے بستروں پر الگ الگ جا لیٹے مگر ایسی دل شکن اور سنگ آمد وسخت آمد باتوں کے بعد نیند کیسے آتی۔ انیس جدا کانٹوں پر لوٹتی رہی۔

طرح طرح کے خیالات اسے چونکاتے رہے۔ احمد الگ بےچین تھا۔ کبھی اٹھ کر وسیع ایوان میں ٹہلتا کبھی بستر پر آ پڑتا۔ اس کو اپنے سایہ میں بلوپ کی روح نظر آئی اور مرنے سے پہلے جو گفتگو ہوئی تھی حرف بحرف یاد آ گئی۔ عورتوں سے نفرت اور حقارت کا جذبہ پھر عود کر آیا۔ زہر میں بجھے ہوئے تیر لئے ہوئے وہ جذبہ جسے اس نے بڑی جد و جہد کے بعد دبایا تھا۔ اس کا دل بری طرح مجروح کرنے لگا حالانکہ انیس بالکل بےگناہ تھی: اس غریب کا اس میں کیا قصور۔ یہ پریشانیاں احمد کی اپنی بلائی ہوئی تھیں۔ لیکن کھسیانی بلی کھمبا نوچتی ہے، طویلہ کی بلا بندر کے سر۔ بیوی کے سوا جھونجل کس پر اترتی؟ آخر اس نے اپنی وحشت میں یہ فیصلہ کیا کہ خلیفہ کو قتل کرا دینا چاہئے۔

قتل اور ایک بڑی سلطنت کے بادشاہ کا، کوئی چوہے بلی کا مارنا تھا۔ اس مرحلہ کی ساری دشواریاں احمد کے سامنے تھیں۔ محل کی سنگین دیواروں اور حبشی پہرہ داروں میں سے گزر کر اندر داخل ہونا پھر اتنی بڑی شخصیت پر ہاتھ اٹھانا جس کے اشاروں میں موت و حیات ہو وہ بھی جانتا تھا کہ ناممکن ہے۔ مگر سابقہ محبت کو اپنے مرکز پر لانے اور ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑنے کی اس کے خیال میں دوسری شکل ہی نہ تھی۔ کیا وہ انیس کو بالکل سچا سمجھ لیتا اور اپنی بدگمانیوں کو جو اس کے ایوان میں داخل ہو گئی تھیں خاک ڈال دیتا؟ محبت کی افراط و تفریط اور اس کی بےبصری ایسی ہی ہوتی ہے۔ نتائج سے واسطہ نہیں رہتا۔ جتنے واقعات سرزد ہوتے ہیں صرف ایک ہنگامی جذبے کے ماتحت۔

اپنے خیالات، تصورات اور محسوسات سے لڑتے لڑتے احمد تھک گیا تھا۔ اس کے دماغ کی رگیں پھٹی جا رہی تھیں۔ سکون کی ضرورت تھی وہ باغ کے صحن میں مرمریں حوض پر جا بیٹھا اور آسمان کے تارے گننے لگا۔ چاند اس وقت نہ تھا۔ در و دیوار پر چاروں طرف تاریکی کے سیاہ پردے پڑے ہوئے۔ یکے کہ حرم کا نقرئی دروازہ کھلا اور انیس شب خوابی کے لباس میں ننگے پاؤں خمار آلود آنکھوں سے اپنے شوہر کی تلاش میں نکلی۔ احمد نے اسے آتے ہوئے دیکھا دل نے گواہی دی کہ وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہے مگر منہ زبان سے کچھ بولا اپنی جگہ سے ہلا۔

وہ ادھر ادھر دیکھتی قریب آئی۔ اس نے احمد کے گلے میں باہیں ڈالنی چاہیں۔ یہ مغرور محبت پیچھے ہٹا۔ وہ پاؤں پر جھک گئی۔ اس کے لمبے اور گھنے بال بھی احمد کے قدم چوم رہے تھے۔ یہ حسین منظر بھی احمد کو متوجہ نہ کر سکا وہ ایک متکبر اور سنگدل حاکم کی طرح بیٹھا رہا۔ انیس نے مضطربانہ پوچھا! "بتلائیے، مجھے کیا کرنا چاہیے ؟" احمد جواب میں منہ بنا کر بولا "بولا کیا بلکہ اس نے حکم دیا کہ "تمہارا کفارہ، خلیفہ کا قتل ہے! ہماری محبت کے شیش محل میں پتھر پھینکنے والے کو تمہارے ہاتھوں سزا ملنی چاہیئے۔"

آسمان کے ستارے زمین کے ذروں پر آنکھیں مار رہے تھے دیواریں خاموش، فضا سنسان اور تاریک تھی مگر انیس کے دل میں نہ کسی قسم کا خوف تھا نہ ہراس۔ اس نے نہایت دلیری اور بیباکی سے جواب دیا "میں حاضر ہوں" ایک نازک کمزور عورت کو ایسے سخت اور دشوار کام کے لئے اس آسانی کے ساتھ مستعد دیکھ کر احمد پر اول اول ایک ہیبت سی طاری ہو گئی۔ وہ دیر تک اس کے چہرہ پر نظر جمائے رہا۔ وہ غور کر رہا تھا کہ آیا جو کچھ کہہ رہی ہے حقیقت ہے یہ دفع الوقتی۔ اور جب یقین ہو گیا کہ واقعی وہ میرے حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہے تو فرطِ مسرت سے اچھل پڑا۔ اس کا پھول سا چہرہ جو جوشِ وفا شعاری میں تمتما اٹھا تھا اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا "کیا سچ مچ تم میرے کہنے پر عمل کرو گی؟ تم نے سوچ بھی لیا کہ کام کس قدر اہم اور جاں دادنہ ہے۔"

انیس۔ میں نے کبھی عدول حکمی کی ہے؟ محکوم کو کام کی نوعیت سے بحث نہیں۔

احمد۔ تمہارے ہاتھوں میں اتنی قوت ہے؟

انیس۔ محبت کی طاقت اس سے بدرجہا زیادہ بڑے بڑے کام کر چکی ہے۔

احمد۔ اگر پکڑی گئیں!

انیس۔ کچھ پروا نہیں!

احمد۔ نہایت ہولناک سزا دی جائے گی۔

انیس۔ چو آب از سر گزشت چہ یک نیزہ چہ یک دست۔

احمد۔ لیکن تمہارے فراق میں میرا کیا حال ہوگا؟

انیس نے ایک پھریری لی۔ جس کا جھٹکا احمد کے دل پر پڑا۔ انیس کی خاموشی نے اب اس پر ایک دوسرا اثر ڈالا۔ اسے نظر آیا کہ وہ محبت کی ماری صحن کے سنگین فرش پر جاڑے کی ٹھنڈی رات میں ڈھیلے ڈھالے ہلکے پھلکے کپڑے پہنے ننگے پاؤں کھڑی ہے۔ اس کے نازک ہونٹوں کا کپکپانا اور ہاتھوں کی خنکی بھی محسوس ہوئی۔ جلدی سے اٹھا، اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دئے اور آہستہ آہستہ لے جا کر خوابگاہ میں پہنچا دیا۔

نواں باب

چاشت کا وقت گزر چکا تھا۔ بغداد کے بازار کھلے ہوئے اور لین دین جاری تھے۔ ایک خاتون انتہائی پردہ داری سے برقعہ میں لپٹی ہوئی قیمتی خچر پر سوار بنہایت تیزی کے ساتھ ایک طرف سے دوسری جانب جا رہی تھی۔ آگے آگے خواجہ سرا کوڑا ہاتھ میں لئے "طرقوا طرقوا" کی صدائیں لگاتا آگے آگے دوڑ رہا تھا اور پیچھے پیچھے کئی زریں کمر غلام گنگناتے لپکے چلے جاتے تھے۔ ہوا خوری کا یہ وقت نہیں۔ امرا کی بیگمات ضرورتاً بھی نکلتی ہیں تو سہ پہر کو۔ لیکن اتنے بڑے غدار شہر میں کسی نے دیکھا بھی نہیں کہ کون ہے۔ بے وقت کیوں نکلی اور اس قدر عجلت کا کیا سبب ہے؟ چلتے چلتے جامع مسجد کے قریب وزیر اعظم کی حویلی کے سامنے یہ سواری گی۔ خاتون اپنے خچر سے اتر ایوان وزارت میں داخل ہوئی۔

وزیر اعظم کون ہے؟ ادریسی! اس وقت اس کے در دولت پر ایک مجلس مشاورت منعقد تھی۔ بڑے بڑے ارکان سلطنت اور ارباب حکومت جمع تھے۔ ملکی معاملات کی بگڑی ہوئی صورتیں درپیش تھیں۔ شورش اور انقلاب پسندوں کو دبانے اور نظام عمل کو برقرار رکھنے پر گفتگو تھی۔ مہرکاروں اور خبر رسانوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ کہیں کسانوں کو لگان کی زیادتی کی شکایت تھی۔ کہیں عاملوں کی خودسری کے اعلان ہو رہے تھے۔ سپاہ بھی ایک عرصہ دراز سے جمودی حالت میں پڑے پڑے اکتا کر حرکت میں آنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے

چھوٹی موٹی سازشوں کو تو ادریسی نے اپنی حکمت عملی سے دبا دیا تھا۔ فوج کے مطالبات اور ملک کی بعض ابھری ہوئی جماعتوں کو قوت یا نرمی سے تھپک کر فضا میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہونے دی تھی مگر کب تک۔ گوشہ گوشہ میں جب آگ لگ جائے تو کیا کرے۔ سلطنت کا کام اقبال کے سایہ میں چلتا ہے۔ ہما الّو بن کر منڈلانے لگے تو پھر ہر طرف بربادی ہی بربادی نظر آتی ہے۔ یار اغیار ہو جاتے ہیں۔ کوئی تدبیر سیدھی نہیں پڑتی۔ خدا کی شان بغداد کی خلافت اور ایک خواجہ سرا کے سہارے۔ اس وقت وہی سلطنت کے حل و عقد کا مالک تھا۔ اسی کے ناخن پیچیدگیوں کو سلجھا رہے تھے۔ گویا مردہ خلافت اسی کے دم سے کچھ سانس لے رہی تھی۔

غرور کا انجام ذلت ہے، جہاں دماغ فلک پیما ہوا اور زمین دیکھی۔ بادشاہ جب تک اپنے ملک کا راعی ہے، خدا بھی اس کا ساعی ہے۔ اور جب وہ قصائی بن گیا تو ایک دن اس کیلئے گھونٹا تیار ہے۔ خود فریبی کا ظرف ابلا اور چلا پھر خالی ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ دولت اور حکومت کے نشہ کی سہار بڑے مردوں کا کام ہے۔ انسان نے یہ دو جام پیئے اور اپنی ہستی سے بیگانہ ہوا۔ اپنی ہستی کو بھولا اور گرا۔ اول اول حمزہ خاصہ سنبھلا ہوا چلا۔ امورِ سلطنت کو دل لگا کر انجام دیا۔ کوئی مشکل سامنے نہ آئی اور جو آئی بھی چٹکی بجاتے حل ہو گئی۔ چند روز کے بعد وہ اپنے اقبال کے گھمنڈ میں آگیا۔ مشیروں کی خوشامد اور لت۔ انہوں نے اُسے ملک داری کے امور فرائض سے بے نیاز کر دیا۔ مصاحبوں کی صحبت کا سرور بڑھا۔ عیش و عشرت کی محفلیں جمنے لگیں۔ پھر کیا تھا سرور سے خمار کی نوبت آگئی۔ اسی سرور کے زمانہ میں ادریسی خواجہ سرا سے وزیر اور وزیر سے وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اور خمار کے دنوں میں تو سلطنت کی زمام ہی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ سیاہ سفید کا بالکلیہ مالک تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ادریسی ایک خواجہ سرا تھا لیکن اسے کیا کیجئے کہ قدرت اس کو نوازنا چاہتی تھی اور اپنی نوازش کے لئے اس کے اندر بہت سی قابلیتیں پیدا کر دی تھیں۔ انتظامی معاملات میں اس نے نہایت ہوشیاری سے کام لیا۔ فریادیوں کی فریاد سنتا۔ داد دیتا۔ انصاف کرتا۔ خلیفہ کی بے رخی نے ادریسی کو ہر دلعزیز

بنادیا تھا۔ ساری رعایا اس کی مٹھی میں تھی۔ امراء اس کے کہنے پر چلتے۔ غرضیکہ اس نے اپنے برتاؤ سے وہ بات پیدا کر لی کہ خلیفہ سے زیادہ لوگ اس کی عزت اور اعتبار کرتے۔

مجلس شوریٰ گرم تھی، ارد گرد امراء و وزراء بیٹھے تھے۔ بیچ میں ادریسی بیٹھا سب کی سن رہا تھا کہ اس نے ایک نقاب پوش خاتون کو ایوان کے باہر ایک کونے میں کھڑا ہوا دیکھا۔ سمجھا کوئی مظلومہ فریاد لے کر آئی ہے۔ اپنی خدا ترسی دکھانے کے لئے فوراً اپنی شاندار جگہ سے اٹھا اور اس کے پاس جا کر پوچھا "اے شریف خاتون تو کون ہے اور کس غرض سے یہاں آئی ہے کیا میں تیری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟" عورت بولی "آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں" آواز سنتے ہی ادریسی سمجھ گیا اور نہایت تپاک سے کہنے لگا "خوش آمدید انیس جلیس، خوش آمدید!"

ادریسی کی صورت اور اس کے اس طرح پیش آنے سے انیس کو نشاط باغ کی بارہ دری کے واقعات کا خیال آگیا اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ایک لمحہ کیلئے وہ اپنے کو بھول گئی لیکن فوراً ہی اس نے اپنے اوپر قابو پالیا اور سنبھل کر بولی "مجھے جناب سے تخلیہ میں ایک راز کی بات کہنی ہے"۔

ادریسی کو اپنی شرافت کی شہرت پر فخر تھا۔ بغداد میں سب جانتے تھے کہ اپنی عمر کے بہت سے سال حرم میں گزار چکے تھے۔ بیگمات سے گھل مل کر باتیں کرنے میں اسے کوئی جھجک نہ تھی۔ اور ایک خواجہ سرا ہونے کی حیثیت میں اس پر کوئی غیر معمولی اتہام بھی نہیں لگ سکتا تھا۔ اس لئے وہ انیس کو علیحدہ لے جا کر اس سے گفتگو کرنے کے لئے بلا پس و پیش تیار ہو گیا پھر اس کو انیس کی خاطر بھی منظور تھی اس کے کام کی اہمیت کا بھی خیال تھا۔ نیز اس کے قوائے دماغی تھوڑی دیر کیلئے مجلس مشاورت کی بحث و تمحیص سے بچ کر آرام بھی لینا چاہتے تھے۔ بہرحال ادریسی اپنے ساتھیوں کو چھوڑ برابر کے ایک کمرہ میں انیس کو لے گیا اور دروازہ بند کر دیا۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ انیس نے کہنا شروع کیا "جناب عالی! میری کہانی ذرا درد انگیز ہے، آپ توجہ سے سنیں۔

ادریسی۔ کیا معنی؟ کوئی نئی مصیبت آئی؟

انیس۔ جی ہاں: ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے!!

ادریسی۔ اچھا کہو میں متوجہ ہوں۔

انیس۔ آپ کی ہدایت کے مطابق احمد سے واقعات کا قصہ سنا رہی تھی کہ جیسا میرا خیال تھا اس نے بیسیوں سوال کر ڈالے۔ ایک ایک بات کو طرح طرح سے کریدا۔ اگرچہ میں نے بہت سنبھل سنبھل کر جواب دئے لیکن آپ جانتے ہیں کہ سچ سچ ہے اور جھوٹ جھوٹ۔ اس کے علاوہ میاں بیوی کا تعلق جتنا مضبوط اسی قدر نازک بھی، میں زیادہ دیر تک راز کو پوشیدہ نہ رکھ سکی اس کی رنجیدگی اور اپنی محبت کا پاس آگیا۔ دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ سا معلوم ہوا اور میں نے سب کچھ بے کم و کاست کہدیا۔

ادریسی۔ (غصہ میں سُرخ ہو کر) بدنصیب عورت! کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اس معاملہ میں تمہاری سچائی جھوٹ سے بدتر ثابت ہو گی میری پیشین گوئی کا تم کو یقین آیا؟

انیس۔ بیشک جو آپ نے فرمایا تھا وہی پیش آیا۔ لیکن ......

ادریسی۔ (چیخ کر) لیکن کیا؟ اب جیسا کیا ویسا بھگتو!

انیس۔ (اپنی رو میں) لیکن مشکل یہ تھی کہ احمد مجھ سے بدگمان ہو چکا تھا۔ اور اب اسے مجھ پر مطلق بھروسہ نہیں رہا۔

ادریسی۔ (ذرا نرم ہو کر) پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔ کسی کے گھریلو معاملات میں مجھے کیا دخل؟

انیس۔ ایک شریف خدا پرست انسان کبھی کسی حالت میں بھی اپنے ابنائے جنس سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ پھر آپ تو اس وقت نائب خلیفہ، مدار المہام سلطنت ہیں۔

ادریسی پر جیسا چاہئے تھا انیس کے ان فقروں کا اثر ہوا۔ وہ خوشی کے مارے پھول گیا اور بظاہر روکھے منہ سے بولا، "میری بابت تم نے اس سے کیا کہا؟"

انیس۔ آپ کی مہربانیاں اس کے سامنے دہرا دیں۔

ادریسی۔ میری کسی کمزوری کا تو ذکر نہیں کیا؟

انیس۔ کمزوری کیسی۔ کیا آپ میں کوئی کمزوری بھی ہے؟

ادریسی۔ (مسکرا کر) شاید!

انیس۔ توبہ توبہ، بندہ نواز! اول تو آپ کے برتاؤ بالکل صاف تھے۔ میں ان کو توہمات کی تاریکی سے کیوں مکدر کرتی۔ اور گر کسی فوری جذبہ کے ماتحت کوئی برائی کرتی تو یہ میری انتہائی احسان فراموشی تھی۔ میں نے بجز تعریف کے آپ کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

ادریسی۔ احمد کا میرے متعلق کیا خیال ہے؟

انیس۔ میری رہائی کے دوسرے دن صبح کو کیا اس کے خیال کی تصدیق آپ کو نہیں ہوئی؟ اس کے دل میں اسی طرح آپ کی قدر اور آپ کی نیازمندی کا جوش ہے جس طرح میرے دل میں۔

ادریسی نے خوش ہو کر انیس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور نہایت مخلصانہ لہجہ میں یقین دلایا کہ "میں تمہارا دوست اور خیر اندیش ہوں۔ مجھ کو ہر حال میں تم اپنا مربی پاؤ گی۔ لیکن آئندہ ایسی بے احتیاطی نہ کرنا۔ جب کسی کو اپنے سے بہتر سمجھ کر مشورہ لیا جائے تو اس پر آخری دم تک کاربند رہنا چاہئے۔ ورنہ رائے کی غلطی کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

انیس۔ انشاء اللہ تعالیٰ اب ایسا نہیں ہوگا۔

ادریسی۔ اچھا اب احمد کا کیا ارادہ ہے وہ تم سے کیا چاہتا ہے؟

انیس۔ وہ مجھ سے ثبوت مانگتا ہے۔

ادریسی۔ وفاداری کا؟

انیس۔ نہیں!

ادریسی۔ محبت کا؟

انیس۔ میری وفاداری اور محبت کا تو اسے اعتراف ہے۔

ادریسی۔ یا اللہ! پھر کس بات کا ثبوت؟

انیس۔ اس کا مطالبہ ہے میں یہ ثابت کروں کہ خلیفہ محمد کو تصرف میں نہیں لایا۔

ادریسی۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا غداری اور محبت اس کا ثبوت نہیں؟

انیس۔ یہ قولی ثبوت ہیں۔ وہ فعلی ثبوت چاہتا ہے۔

ادریسی باوجود نہایت تیز فہم اور بات سے پہلے بات کی تہ تک پہنچ جانے کے حیران تھا کہ احمد کا کیا مطلب ہے اور ان معاملات کا محمد سے کیا علاقہ۔ تاہم وہ اتنا ضرور سمجھا کہ یہ ملاقات کوئی اہمیت ضرور رکھتی ہے۔

ادریسی۔ خدا کی بندی معموں میں باتیں نہ کر۔ جو کچھ کہنا ہے کھل کر کہہ؟

انیس۔ آپ اپنی خاتمِ وزارت بطور ضمانت مجھے عنایت فرمائیں۔

ادریسی۔ کس بات کی ضمانت؟

انیس۔ میری اور احمد کی!

ادریسی نے دو چار لمحہ تامل کرنے کے بعد اپنی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور اس کو دے دی انیس نے انگوٹھی جس کے نگینہ پر ادریسی کا طغرا کھدا ہوا تھا اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں دبا لی اور پوچھا "کیا میری اور احمد کی جان کا تحفظ اسی طرح یقینی ہے جس طرح آپ کی عزت اور علوئے شان کی حد میں اس انگشتری کا میری مٹھی میں ہونا؟"

ادریسی۔ یقینی! کوئی خوف نہ کرو۔ جو کچھ تم سوچ کر آئی ہو اور جو کچھ تمہیں کہنا ہے بے دھڑک بے تکلف کہو۔ میں نہ صرف تم دونوں کی جان کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہوں بلکہ تمہاری آزادی تمہاری آبرو اور تمہارا مال بھی بدستور رہے گا۔ خاطر جمع رکھو کہ ہر معاملہ میں میرا مشورہ میری حمایت اور میرے شریفانہ خیالات تمہارے ساتھ ہیں۔

انیس۔ (ادریسی کے کان کے پاس منہ لے جاکر) احمد محمد سے ایک فعل کا مطالبہ کرتا ہے جو قدرت کا خاص کرشمہ ہو۔

ادریسی۔ عجیب دماغ کا انسان ہے۔

انیس۔ اس کے بغیر وہ مطمئن نہیں ہو سکتا۔

ادریسی۔ (ایک لمحہ غور کرکے) پھر تم نے کیا سوچا ہے؟ وہ قدرت کا کرشمہ کیا ہوگا؟

انیس۔ خدا ہی جانے۔ میری تو اب تک کچھ سمجھ میں آیا نہیں۔

ادریسی۔ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟

انیس۔ آپ مجھے ایک مرتبہ خلیفہ کے سامنے پیش کر دیں۔ میں اس کے روبرو کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔ جس ماحول میں مجھ پر یہ آفت آئی ہے مجھے یقین ہے وہیں میری بے گناہی کا ثبوت بھی پیدا ہو جائے گا۔ شاید قدرت کوئی ویسا کرشمہ دکھائے جس سے احمد کا اطمینان ہو۔

ادریسی۔ جتنا عجیب احمد کا مطالبہ ہے اس سے زیادہ عجیب تمہاری خواہش ہے۔ کیا خلیفہ سے کچھ کہنا ہے؟

انیس۔ امیر المومنین سے کچھ عرض کرکے کیا مجھے اپنی رہی سہی بھی عزت گنوانی ہے۔ ان سے مدد لینے کے تو یہ معنی ہیں کہ احمد جس قدر چاہے مجھے بدکار، بے اعتبار اور مکار سمجھ لے۔

انیس یہ باتیں کچھ ایسی نرمی اور معصوم انداز میں کر رہی تھی، اس کا چہرہ ایسا شاندار اور نورانی معلوم ہوتا تھا کہ ادریسی اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس وقت انیس احمد جوہری کی بیوی نہیں کوئی ساحرہ ہے یا اس کے روپ میں کوئی دوسری ارفع طاقت کارفرما ہے۔

چھوٹا آدمی جب بخت و اتفاق سے بڑے درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو اپنے سوا کسی طاقت کو نہیں مانتا۔ اسے صرف اپنی ہی قوتوں پر بھروسہ ہوتا ہے۔ وہ سنتا ضرور تھا کہ فلاں شخص روحانیات کا عامل ہے اور فلاں صاحب اسرار ہے مگر اس کے نزدیک یہ سب فضول باتیں تھیں۔ زندگی میں صرف ایسے ایک درویش سے اس کو واسطہ پڑا تھا جس نے پیشین گوئی کی تھی کہ وہ دنیا میں انتہائی ترقی کرے گا۔ اس کے اقبال کو پر لگ جائیں گے اور وہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد پوری بھی ہو گئی۔ کہاں حرم شاہی کا معمولی خواجہ سرا اور کہاں وزیر اعظم کا مرتبہ۔ ادریسی کو غالباً اس درویش کا کہنا یاد بھی نہ ہوگا اور یاد ہوگا بھی تو اس کے لئے وزارت سے زیادہ اور کیا مادی ترقی

ہو سکتی تھی۔

نسلاً ادریسی عرب تھا۔ چھوٹی سی عمر میں بدو سے کہیں سے چرا لائے تھے۔ اپنے کنبہ قبیلے سے الگ وہ اپنی خانہ بدوشوں میں پلتا بڑھتا رہا۔ صورت اچھی تھی اور ان دنوں ایسے غلام جو خواجہ سرائی کا کام دے سکیں اچھی قیمت پاتے تھے اس لئے ان حضرات کو قوت رجولیت سے محروم کر کے بغداد میں بھیج دیا۔ اب یہ ایک سوداگر کے ہاتھ لگا۔ اس نے دیکھ کر لڑکا ہوشیار ہے۔ تعلیم و تربیت سے آراستہ کر حمزہ کے باپ عجیب کی محلسرا میں داخل کرنے کا بندوبست کیا۔ حریم خلافت میں پہنچنا تھا کہ اندر و باہر سب جگہ پیر گیا۔ عقلمندی، معاملہ فہمی، دیانت داری اور اپنی کارگزاری کی بدولت بلند ہونا شروع ہوا۔ خلیفہ عجیب کے بعد حمزہ نے اسے اپنا مشیر بنا لیا۔ اور جب حمزہ کے ہاتھ خلافت کا تاج تھامتے تھامتے اکتا گئے یہ مسند وزارت پر جا براجا۔

دنیا میں کوئی شخص رزق مقدر پر قانع نہیں ہوتا۔ اس کی خواہشیں برابر بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ خلیفہ کی غفلت اور بدعنوانیاں، ملک کی ابتر حالت ادریسی کے سامنے تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ فوج میں ہیجان پیدا ہو، جا بجا شورشیں پھیلیں، فسادات ہوں تو کچھ اپنا کام بنے۔ فصل پکی پکائی کٹائی کیلئے تیار کھڑی تھی۔ وقت کا انتظار تھا۔ ادریسی نے شہر میں اچھی شہرتیں حاصل کر لی تھیں۔ ادنیٰ و اعلیٰ سب اس کے مداح تھے۔ یعنی اگر خلیفہ اور وہ مقابلہ پر اتر آتے تو شاید اسی کو کامیابی ہوتی۔ تاہم اس کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ کھلم کھلا اپنا جھنڈا بلند کرے اور بیٹھے بٹھائے بدنامی مول لے لیکن اسے کیا خبر تھی کہ قدرت اس کے لئے چپکے ہی چپکے ایسا سامان پیدا کر رہی ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ حقیقت میں عالم الغیب ہی ہونے والی باتوں کو جانتا ہے۔ اسے سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک کمزور عورت، شوہر کی حماقتوں میں مبتلا ہو کر اور جو اس وقت اس کے سامنے کھڑی ہے اس کو خلیفہ بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

ایک ایسے سیاست دان اور ٹھنڈے دماغ والے شخص کی طرح جو اپنے تخیلات کو خاموشی کے پردے میں پرورش کرتا رہتا ہے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو اپنے موافق بنانے کی

کوشش کرتا ہے اور رات دن لطیفۂ غیبی کے انتظار میں گھڑیاں گنتا ہے۔ ادریسی بھی ہر بات کو غور سے سنتا اور جہاں تک اس میں اپنے لئے کوئی مضر پہلو نظر نہ آتا وہ بلا تاخیر اسے منظور کر لیتا۔ چنانچہ انیس کی خواہش کا اس نے اپنے دل میں تجزیہ کیا۔ خواہش انوکھی ضرور تھی۔ احمد کی تسکین خلیفہ کے سامنے جا کر آخر کیونکر ہوتی لیکن چونکہ انیس کے اس مطالبہ میں اس کا کوئی نقصان نہ تھا بلکہ اپنے لئے کچھ مبارک ہی سمجھا کہ اگر خلیفہ نے کوئی بدعنوانی کی تو اس کے دامنِ اقبال پر ایک اور داغ لگ گا۔ اس کے قدم تختِ خلافت سے گرنے کے لئے اور زیادہ ڈگمگا جائیں گے۔ ممکن ہے یہی خاتمہ کا بندھ ہو۔ اس لئے اپنے جذبات پر جلدی قابو حاصل کر کے بولا۔ تمہاری درخواست گو درخورِ اعتنا نہیں۔ مگر مجبور ہوں کہ میں نے قسم کے ساتھ تمہاری ہر امداد کا وعدہ کیا ہے جس کی ضمانت میں میری انگوٹھی تمہاری مٹھی میں ہے۔ مطمئن رہو، کوشش کروں گا کہ تمہیں خلیفہ کے حضور میں پیش کر دوں۔ البتہ اس کے نتائج کا ذمہ دار نہیں۔ یہ تم خود سوچ لو کہ تمہارا مقصد کہاں تک پورا ہوگا۔ کہیں خلیفہ کی بوالہوسی کا شکار نہ ہو جاؤ۔

انیس۔ احمد کو مجھ پر شک ہے اور اس کا شک دور کرنے کے لئے مجھے ہر ممکن قربانی کرنی پڑے گی۔ میں ہر آفت کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔ مجھ کو اپنی جاں نثاری کے ثبوت کی خاطر انتہائی خطرناک اقدام سے بھی دریغ نہ کرنا چاہئے۔ میں نہیں چاہتی کہ احمد کو کبھی میری محبت میں شبہ کی گنجائش رہے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا اور اس کا شک نہ مٹا تو میری زندگی ہیچ ہے میرا سارا کیا دھرا خاک میں مل جائے گا۔ اس لئے آپ دیکھیں گے اور میں دکھا دوں گی کہ میں کس طرح اپنے آپ کو اپنے شوہر کی وفادار اور پاکدامن بیوی ثابت کرتی ہوں۔

زمانہ برابر کروٹیں بدل رہا تھا۔ روز نئے نئے سانحے پیش آ رہے تھے، انقلاب کی زنجیر ہر لمحہ مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ ادریسی نے موقع پا کر ایک دن خلیفہ سے عرض کیا: "امیر المومنین! محمود کے بیٹے احمد جوہری کی بیوی انیس میرے پاس آئی تھی، وہ حضور کی زیارت سے اپنی آنکھیں روشن کرنا چاہتی ہے۔"

خلیفہ۔ اس خوبصورت چڑیل کا میرے سامنے نام نہ لو۔ اس کا بشرہ خونیوں کا سا ہے وہ مجھ سے دُور ہی رہے تو اچھا۔

ادریسی۔ معلوم ہوتا ہے امیرالمومنین کو اب تک اس پر غصہ ہے، میں بھی اسے واقعی بدنصیب سمجھتا ہوں۔ اس نے بلاوجہ حضور کو ناراض کر دیا۔ لیکن اب وہ گستاخی پر نادم ہے۔ اس نے میرے قدموں پر سر رکھ کر درخواست کی ہے کہ امیرالمومنین اپنی کنیز کو معاف کر دیں اور اپنے دیدار سے اسے مشرف فرمائیں۔ میں اس کو چور راستوں سے یہاں لے آؤں گا۔ عالیجاہ! وہ اپنے کچھ اور کمال بھی دکھانا چاہتی ہے۔ دنیا میں عورت سے بڑھ کر اور کوئی چیز نازک نہیں۔ دل کو تو آبگینہ کہتے ہی ہیں مگر اللہ کی یہ مخلوق مجسم شیشہ ہوتی ہے۔ ان کی دلشکنی کا سب کو خیال رکھنا چاہئے اور حضور تو ظل اللہ ہیں۔ اس کے گناہوں کو معاف فرمادیں۔

قصہ مختصر ادریسی نے باتیں بنا بنو کر خلیفہ کو شیشہ میں اتار لیا۔ یہ تجویز کہ انیس چھپوں نشاط باغ کی بارہ دری میں پہنچا دی جائے گی۔ ایک عیاش کے پرچانے کیلئے کافی تھی۔ پچھلی بدمزگی کا خیال اس کے دل سے اتر گیا اور اجازت دے دی کہ "تمہاری خاطر سے منظور کرتا ہوں بھیج دینا۔"

انیس کے تو تلوؤں سے لگی ہوئی تھی، اطلاع ملتے ہی سرِ شام ادریسی کے دولت کدہ پر پہنچ گئی اور مغرب کی نماز کے بعد اندھیرا ہوتے ہی وزیر کے پیچھے پیچھے غیر معروف راستوں سے خلیفہ کے پاس جا پہنچی۔ ادریسی بھی اپنے اصلی لباس میں نہ تھا۔ کسی نے یہ بھی نہ جانا کہ یہ مرد کون ہے اور عورت کون۔ اس قدر تیزی سے کیوں جا رہے ہیں جدھر وہ مڑتا ہے اسی طرف یہ، پھر بھی ایک دوسرے سے اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ اتفاق کی بات کہ اس روز احمد بھی اپنے کاروبار میں اسقدر مصروف تھا کہ چراغ جلنے کے بہت دیر بعد گھر پہنچا۔ اسے انیس کے خلیفہ کی خلوت میں جانے کی خبر تک نہ ہوئی۔

حمزہ، اپنے دل میں نہ جانے کیا کیا منصوبے گانٹھے بارہ دری میں انیس کا منتظر تھا کہ وزیر سلطنت ادریسی خواجہ سراؤں کی طرح انیس کو لے کر پہنچا۔ مگر اس سے پہلے کہ خلیفہ کی نظر اس پر پڑے

دور ہی سے انیس کو اکیلا چھوڑ اوپر غلام گردش میں جا ایک طرف پردے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ انیس آگے بڑھی اور کنیزوں کی طرح نہایت ادب کے ساتھ جھک کر سلام کیا۔ خلیفہ مسکرایا اس کی مسکراہٹ میں بدنیتی اور شوخی تھی۔ اس نے بڑے تپاک سے سلام لیا اور نہ معلوم کس غرض سے، شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی ہے تو نہیں پیچھے مڑا۔ اس کا مڑنا تھا کہ ایک بجلی سی کوندی۔ زہر میں بجھی ہوئی چھری خلیفہ کے سینے میں پیوست تھی۔ انیس کا نہیں ملک الموت کا ہاتھ تھا جس نے دم کے دم میں کام تمام کر دیا۔ حمزہ تڑپ کر زمین پر گرا۔ خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ ادریسی لپک کر نیچے آیا۔ خلیفہ کو سکرات میں پایا۔ آنکھیں بند۔ چہرہ پر مردنی۔ خرخر کی آواز کے سوا کچھ نہ سنائی دیا۔ انیس سنگین بت کی طرح خاموش کھڑی تھی۔ ادریسی نے مراد پائی۔ خلیفہ دم توڑ رہا تھا اور اس کی آرزوئیں پوری ہو رہی تھیں۔ اس خدا ساز سامان کو دیکھ کر پہلے تو اس پر ایک عجیب حالت طاری ہوئی لیکن پھر وہ سنبھلا اور انیس سے کہنے لگا "ضابطہ کی کارروائی کرنے کے لیے مجھے تم کو حراست میں لینا ضروری ہے۔ اتنے بڑے واقعات کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ تم کسی طرح کا فکر نہ کرو، دوسرے خلیفہ کا انتخاب ہوتے ہی تم آزاد ہو۔ میں کل قید خانہ میں آکر تمہیں رہا کر دوں گا۔"

اتنا کہہ کر ادریسی نے ہائے وائے کے نعروں سے سارا محل سر پر اٹھا لیا۔ چوبدار، پاسبان لونڈیاں، غلام، سب باہر سے دوڑے دیکھا کہ خلیفہ خون میں بے جان پڑا ہے اور وزیر اعظم گریبان چاک، سر پر خاک شدت غم سے پچھاڑیں کھا رہے ہیں۔ اللہ کی شان چند لمحہ کے اندر اندر عیش خانہ ماتم کدہ بن گیا۔ انیس فوراً مجلس شاہی میں بھیج دی گئی۔ اور ادریسی نے اپنے انتظامات شروع کر دیے۔ اچھی خبروں کو تو کچھ دیر بھی لگتی ہے مگر بری خبریں تو ہوا کے ساتھ اڑتی ہیں۔ رات بھر میں باوجود احتیاط کے یہ خبر بغداد کے اس گوشے سے اس گوشے تک پھیل گئی کہ خلیفہ کو ایک عورت نے قتل کر دیا۔ خبروں کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ مغرب اور عشاء کے درمیان یہ حادثہ ہوا۔ احمد بھی تقریباً اپنی دوکان سے اسی وقت چلا۔ آج اسے کاروبار کے سلسلہ میں

غیر معمولی معروفیت رہی تھی۔ گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ گلی میں شور و غل کی آوازیں سنیں۔ اُلٹے پاؤں باہر نکلا کیا دیکھتا ہے کہ لوگوں کا ایک جم غفیر سراسیمہ یہ کہتا ہوا گزر رہا ہے کہ خلیفہ حمزہ مارا گیا۔ اس کے حواس اُڑ گئے، پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ تھر تھرا اٹھا۔ بے تحاشا اندر دوڑا اور حرم میں جا کر دل جلوں کی طرح منہ اٹھا اٹھا کر زور زور سے یا انیس یا انیس! چلانے لگا۔ انیس گھر میں کہاں تھی۔ معلوم ہوا سرِ شام سے کہیں گئی ہوئی ہے۔ اور کچھ کہہ کر بھی نہیں گئی۔ اس کا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنک گیا تھا اب جو انیس کو غائب پایا تو اپنے گمان میں کوئی شبہ ہی نہیں رہا۔ گھوڑے پر سوار ہو سرپٹ چوک کی طرف چلا کہ شاید کچھ تفصیل معلوم ہو۔ چوک میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ لوگ برابر چہ میگوئیاں کرتے جمع ہوتے چلے جاتے تھے۔ عموماً شہر کا چوک ہی اس قسم کے اجتماعات کا مرکز ہوا کرتا ہے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی۔ آدمیوں کی بھیڑ، مشعلوں اور قندیلوں کی روشنی۔ بالکل ایسا سماں تھا جیسے کسی بڑے دریا میں کشتیوں کی سیر ہے۔ واقعہ کی نسبت رائے زنیاں ہو رہی تھیں مگر حقیقت سے سب بےخبر تھے۔ احمد بڑی مشکل سے مجمع کو چیرتا، اپنی جلد بازی پر لوگوں کی ملامت سنتا وزیر اعظم ادریسی کے محل تک پہنچا۔

مشعلوں کی رات کو دن بنانے والی روشنی میں ادریسی ایک بلند منبر پر کھڑا احکام جاری کر رہا تھا۔ قاصد ملک کے صوبہ داروں کے نام فرمان لے جانے اور فوجی حکام نئے انتظامات کے لئے چاروں طرف کمر بستہ کھڑے تھے۔ احمد کو وزیر تک پہنچنے میں بڑی دشواریاں تھیں۔ وہ دور کھڑا ہو گیا۔ احکام سنتا رہا۔ اس نے وہ فرمان بھی سنا جو قاصدوں کو اطرافِ ملک میں پہنچانے کیلئے ادریسی کی زبان سے نکلا تھا کہ "حمزہ نے دار الخلافت کے ایک شریف اور معزز امیر کی بیوی کو اغوا کیا تھا جس کی پاداش میں خدا نے اسی عورت کے ہاتھوں اس کا قتل کرا دیا۔ ایک ظالمانہ اور شریعتِ اسلامی کو ٹھکرانے والی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اللہ بڑا منصف ہے، اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں، حمزہ کے ساتھ خلافت پر لگے ہوئے داغ بھی مٹ گئے۔ اب عنانِ حکومت ادریسی کے ہاتھ میں ہے جو خدا ترس، راست باز، عاملِ شریعت اور ہر دلعزیز ہے"۔

یہ سن کر احمد پر غشی کی حالت طاری ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا سا آگیا۔ وہ سنبھل کر اپنا گھوڑا موڑنے ہی کو تھا کہ ادریسی کی نظر پڑ گئی۔ اونچی جگہ کھڑے ہونے کی وجہ سے ادریسی سب کو دیکھ سکتا تھا۔ پہچاننے کی دیر تھی اس نے فوراً احمد کی گرفتاری کا حکم دیا۔ وقت کی نزاکت اور موقع کی اہمیت کا یہی تقاضہ تھا۔ عشق و محبت کے معاملات دوسرے ہیں اور سیاست کا نقطۂ نظر دوسرا۔ اسلامی قانون کی پابندی ضروری تھی۔ اسے یہ دکھانا تھا کہ نیا خلیفہ نہ دولت سے مرعوب ہوتا ہے نہ کسی اور جذبہ سے وہ تعزیر کے تازیانے سے خواہشات نفسانی کے غلاموں کی بلا تامل پہلی فرصت میں کھال اُدھیڑنے کے لئے تیار ہے۔ حالانکہ یہ باتیں صرف دکھانے کی تھیں۔ احمد کے قید میں ڈالنے سے اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں سے کچھ کہنے نہ پائے۔ جسم کے ساتھ اس کی زبان بھی بند ہو جائے اور دنیا اندھیرے کی اندھیرے میں رہے۔ دولتمند کے بہت سے طرفدار ہو جاتے ہیں۔ مبادا شورش پسندوں کو ایک نیا شگوفہ ہاتھ آئے۔ اور اس کی شہرت میں بٹہ لگے۔ کیونکہ اس کا دامن بھی تو خلیفہ کے خون میں آلودہ تھا ؞

دسواں باب

ادریسی نے رات ہی صبح تک خلافت کا بوجھ اپنی پشت پر درست کیا۔ اپنے حامیوں کو سراہا۔ صبح سے دوپہر تک ان وفود سے ملاقاتیں کرتا رہا جو مبارک باد پیش کرنے اور خلافت کی چوکھٹ پر سر جھکانے آئے تھے۔ دراصل سب سے اہم مسئلہ دارالخلافہ کی فضا کو اپنے موافق بنانا تھا جہاں سے اطاعت یا مخالفت شروع ہوتی ہے۔ گردوپیش کی سطح ہموار ہو گئی اور اندرونی کوئی چپقلش نہ رہی تو پھر بیرونی علاقوں پر قابو پانا کیا مشکل ہے۔ ان مہمات سے فارغ ہونے کے بعد ادریسی اپنی توقعات کے موافق خاطر خواہ کامیابی سے بہت خوش تھا۔ اس نے نہایت دلجمعی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے سے فرصت پائی تو انیس کا خیال آیا۔ اس کے محسوسات بھی معلوم کرنے ضروری تھے، وہ وزارت و خلافت کے سلسلہ کی ایک نازک کڑی تھی۔ اسے کس طرح نظرانداز کرتا چنانچہ عورتوں کے قیدخانہ میں گیا۔

انیس خونیوں کی کوٹھڑی میں بند تو ضرور تھی لیکن اس کا دل مطمئن تھا۔ اس کے آرام و راحت کے لئے ادریسی کے احکام پہنچ چکے تھے۔ دوسرے وہ جانتی تھی کہ میرا یہ فعل کیسا ہی برا سہی ادریسی کے حق میں مفید ہوا۔ میری بدولت اس کو خلافت ملی۔ میرے صدقہ میں اس نے من مانی مراد پائی اور بے مشقت، بلا زحمت۔ تاہم اس نے خلیفہ کو خنجر کھا کر گرتے۔ تڑپتے اور اپنے خون میں لوٹ پوٹ کر جان دیتے دیکھا تھا۔ اس لئے اس پر خوف و ہراس کی وہ تمام علامتیں چھائی

ہوئی تھیں جو ایک خونی کے لئے لازمی ہیں۔ وہ گھڑی گھڑی چونک پڑتی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھتی، بار بار سر ہلاتی۔ کانپ کانپ اٹھتی۔ کبھی منہ ڈھانکتی کبھی کھولتی مگر وہ خوفناک منظر، خلیفہ کا بھیانک چہرہ سامنے سے نہ ہٹتا۔ اسی توحش میں اس نے احمد کو یاد کرنے کی کوشش کی اور اپنے تصور کو بدلنا چاہا کہ کس طرح جان جوکھوں میں پڑ کر اس نے اپنے شوہر کا مان رکھا، اس کے ارشاد کی تعمیل کر کے اسے غم سے نجات دلائی اور کیسی بہادری سے اپنی پاک دامانی کا ثبوت دیا۔

تھوڑی دیر کے لئے ان خیالات نے انیس کو بہلایا اور اس خیالی مسرت میں وہ مسکرائی اور اسے اپنی بست کی دنیا خوشی سے آباد معلوم ہوئی۔ لیکن احمد کا تصور چند لمحوں سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ مرنے والے خلیفہ کی ڈراؤنی شکل پھر اس کے سامنے آ گئی۔ موت و زیست کی کشمکش میں سر زمین پر پٹک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے اور اس کے سینہ میں وہ چھری تیری ہوئی تھی جس سے انیس نے اس پر قاتلانہ وار کیا تھا۔ یہ دل دہلانے اور دماغ چکرانے والے منظر برابر اس بدنصیب اور قسمت کی ہیٹی عورت کو ستا رہے تھے۔ ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی دفعہ اس نے اپنی وحشت میں کوٹھڑی کے کواڑوں کو جھنجوڑا۔ زور زور سے گھونسے مارے اور بار بار دھڑا دھڑ کی آواز اور چیخ پکار سن کر جیلخانہ کی محافظ عورت وہاں آئی اور خاموش رہنے کی تاکید کرتی رہی۔ لیکن انیس کیا مانتی۔ ایک لمحہ کے لئے چُپ ہو جاتی اور پھر اپنے جوش میں اسی قسم کی حرکتیں کرنے لگتی۔ وہ وحشی مقید جانوروں کی طرح کوٹھڑی میں اِدھر سے اُدھر دوڑتی، دیواروں سے سر ٹکراتی، ناخنوں سے دروازہ کے تختے کھرچتی اور چیخ چیخ کر آپ ہی آپ باتیں کرتی۔ کبھی روتی، کبھی قہقہے مار کر ہنستی۔ آخر رفتہ رفتہ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔ آواز میں کمی ہوئی۔ آنکھیں بند ہونی شروع ہوئیں اور وہ نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑی۔ بیہوش ہو گئی۔

حسین قاتلہ ضمیر، محبت، خوف اور دماغی بےچینیوں کا مقابلہ کرتے کرتے۔ بے حال ہو کر زمین پر گر پڑی تھی اور شاید یہی صورتیں اسے بیہوشی کے عالم میں نظر آ رہی ہوں گی۔ کیونکہ کبھی اس کا جسم

تھرتھرانے لگتا اور کبھی اس کی گھگی بندھ جاتی کہ جیلخانہ کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ادریسی خلافت کا سبز عمامہ باندھے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ابو مجید نیا دستور اعظم اور مسرور جلاد اپنی متین اور قہرمان صورتوں میں تھے۔ ادریسی نے ان دونوں کو اشارہ سے باہر ہی روک دیا اور خود بیہوش، نقاب اتری ہوئی انیس کے پاس جاکھڑا ہوا۔ وہ بالکل غافل تھی، تن بدن سے بے خبر مگر اس کا حسن اب بھی چوکیداری کر رہا تھا۔ ادریسی کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ ایسی جلادی کا کام اور چہرہ پر اس درجہ معصومیت اور یہی تو ادریسی دنیا کے کسی انسان کے وہم میں بھی نہیں آسکتا کہ ایک قاتلہ کی صورت باوجود توحش کے اس درجہ حسین اور نورانی ہو سکتی ہے۔ لیکن ادریسی میں تو صنف نازک کی جمالی شان سے لطف اندوز ہونے کا مادہ ہی نہ تھا۔ قدرت اسے ان صنفی تعلقات سے محروم کر چکی تھی۔ وہ صرف دوسروں کے جذبات سے کھیل کرتا۔ تفریحاً دوسروں کے لئے حسن و عشق کا تماشہ دیکھتا اور خود کبھی جذبات کا غلام نہ بنتا۔ عورت اس کے نزدیک ایک مخلوق تھی اسی لئے بیکار دوسروں کے لئے بیکار۔ اور وہ اسے اسی درجہ میں رکھتا جہاں اس کا رہنا موزوں ہے۔ ساتھ ہی اس کو مردوں سے تنفر تھا۔ اس لئے کہ وہ عورت کے معاملہ میں بیوقوف ہوتے ہیں اور شاید اس سے بھی کہ دنیا کے سارے مرد عورت کے حسن سے تمتع حاصل کر سکتے تھے اور وہ نہیں۔ اس کو رشک کہو یا قسمت کی محرومی بہرحال اس کا خیال تھا کہ میں اس لحاظ سے افضل الناس ہوں اور جمالیات کے قریب نہیں کھ سکتا۔

یہاں ایک مصیبت اور بھی تھی انیس کا وجود ادریسی کی راہ میں حائل تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک ناقص العقل ان کے راز کی تہہ تک رہے۔ بحیثیت ایک محافظ قانون کے اسے بہت سی مجبوریاں بھی تھیں۔ بادشاہت کے فرائض بہت نازک ہوتے ہیں۔ اس کے لئے لازمی تھا کہ جرح وقدح کے بعد قتل کی پوری تفصیل معلوم کرے۔ وہ ایسے اہم معاملہ کو جس کی ساری ذمہ داری اس پر عائد ہوتی تھی کس طرح اندھیرے میں چھوڑ دیتا۔ انیس کے پاس آنے کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ تحقیق سے اس کے اندرونی جذبات کا پتہ لگائے اور یہ کہ وہ کس حد تک

اس پر اعتماد کر سکتا ہے۔

ادریسی کے جھنجوڑنے سے انیس نے آنکھیں کھولیں، گھبرائی ہوئی نگاہوں سے ادریسی کو دیکھا۔ وہ بالکل بے خبر تھی کہ ادریسی اب وزیر نہیں بلکہ خلیفہ ہے۔ اس کی خونِ آشام محبت نے ایک خواجہ سرا کو بغداد کے تخت پر بٹھا دیا ہے۔ اس نے ادریسی کی دستارِ خلافت کی طرف بھی غور نہیں کیا۔ ہاں ایک چیز انیس کو اس میں نئی اور غیر معمولی نظر آئی۔ اسے محسوس ہوا کہ ادریسی کے تیور پہلے جیسے محکومانہ نہیں تکبر اور جلال اس پر برس رہا تھا۔ انیس ترسیدہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اپنا لباس درست کیا اور ادریسی کے سامنے نیچی نظر کر کے کھڑی ہو گئی۔ ادریسی بولا "انیس! تمہارے حواس درست ہو گئے؟ ڈرو نہیں جو کچھ میں کہوں اسے سُنو!"

انیس کچھ نہ بولی خاموش گردن جھکائے کھڑی رہی۔ ادریسی نے کہا "میں اپنا وعدہ بھولا نہیں۔ اس کا ایفا مجھے کرنا ہے اور ضرور کروں گا۔ میرا ارادہ تھا کہ بغیر تاخیر کے تمہیں آزاد کر دوں تاکہ تم جلد سے جلد احمد کے ساتھ اپنی جنت تازہ کر سکو لیکن مصلحت یہ ہے کہ تم کچھ دن اور یہاں رہو۔ تمہاری بہتری اور حفاظت اسی میں ہے۔ اس عرصہ میں عوام کی رائے تمہاری طرف سے کمزور ہو جائے گی اور لوگ خلیفہ کی اہمیت نظر انداز کر دیں گے۔"

انیس نے اس کے جواب میں صرف گردن جھٹک کر اپنے سر کے بال جو بیہوشی میں گرنے سے قصابہ کھل کر آگے آپڑے تھے پیچھے کی طرف کر لیے۔

ادریسی۔ (ایک لمحہ تامل کرنے کے بعد) تم یہ نہ سمجھو کہ میں تمہاری خیر خواہی سے گریز کرتا ہوں اگر تم کچھ کہنا چاہتی ہو تو بے کھٹکے کہو۔ میں اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔

انیس کی حالت ابھی تک پوری نہیں سنبھلی تھی۔ خلیفہ کے قتل کا منظر بالکل اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ البتہ ادریسی کی باتوں سے تصورات دھندلے ہو گئے تھے۔ اس نے ایک قسم کی روحانی اذیت محسوس کرتے ہوئے کئی مرتبہ منہ کھولا۔ مگر کچھ نہ کہہ سکی۔ نگاہیں اوپر اٹھتیں اور پھر جھک جاتیں۔

ادریسی۔ (نرم لہجہ میں) کہو، کہو، جو چاہتی ہو بے تامل کہو؟

انیس۔ (بمشکل) لیکن جو کچھ میں چاہتی ہوں اس کا پورا کرنا آپ کی طاقت سے باہر ہے۔

یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئی۔ ذرا اور کھڑی رہتی تو شاید گر جاتی اور اپنی گردن ایک طرف ڈال دی۔ غم واندوہ، یاس وحرماں کے آثار اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہے تھے۔ ادریسی نے نہایت غائر نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا چاہتی ہے مگر پوچھنے میں بھی مصلحت نہ تھی اس لیے انیس کی خواہش دریافت کرنے کیلئے ایک دوسری ترکیب نکالی۔ کہنے لگا "مجھے آج تک یقین نہ تھا کہ عورت بھی ایسی سفاکی کا کام کرسکتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں بھی اتنی قوت ہے کہ بادشاہ کو تخت پر سے دھکیل کر قبر کے گڑھے میں پھینک دے"!

انیس۔ اب تو یقین آگیا!

ادریسی۔ عورت کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔

انیس۔ کیوں؟

ادریسی۔ اُس کے حسن ونزاکت پر دھبا آتا ہے۔

انیس۔ اور جو محبت کا فرمان یہی ہو۔

ادریسی۔ تو کیا تمہارے شوہر کی مرضی تھی کہ تم خلیفہ کے خون میں ہاتھ رنگو؟

انیس۔ احمد اپنے رقیب کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ ہماری محبت نے فتوی دیا کہ ایسے بدنظر شخص کا جو محافظ اسلام ہو کر شریعت سے غداری کرے زندہ رہنا مناسب نہیں۔ میری صفائی کیلئے اسی شہادت پر انحصار ٹھیرا۔ شوہر کے حکم کی تعمیل زوجہ کا فرض ہے۔

ادریسی۔ تاہم عورت کی نزاکت سے یہ سخت کام ناممکن ہے۔

انیس۔ محبت میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ "عشق ازیں بسیار کرد است وکند"، جب عورتیں اپنی جان دے سکتی ہیں تو دوسرے کی جان لینے میں کیا دشواری۔

ادریسی۔ اچھا احمد کا تم آلہ بنیں! کیا اس نے صاف الفاظ میں قتل کا حکم دیا تھا؟

انیس اطاعت کو الفاظ سے بحث نہیں ہوتی۔ میرے شوہر نے مجھے جیسا حکم دیا۔

ادریسی۔ احمد کو تم سے ایسا کام لیتے ہوئے شرم نہ آئی؟

انیس۔ اس سے مجھے کچھ غرض نہیں۔ میں نے اپنی جرأت وصداقت کا ثبوت دے دیا۔

ادریسی نے انیس کو ترحم کی نظر سے دیکھا۔ ایک نامعلوم جذبہ کو سزا کا نے کی ترغیب جس سے وہ ناواقف تھا اور جس نے انیس جیسی شریف عورت کو قتل جیسے مہیب اور سیاہ قلبی کے فعل پر مجبور کیا اس کے تمام مصالح پر غالب آگئی۔ اس نے انیس کی آخر دم تک حمایت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ تاہم وہ محبت کے اس وحشیانہ مطالبہ پر مشکوک تھا کہ ایک شوہر اپنی محبوب بیوی سے ایسے خطرناک کام لے کر کس طرح محبت کا دعویٰ کر سکتا ہے؟

ادریسی۔ دو مرتبہ میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں، تمہیں یاد ہوگا۔ اور اب تیسری دفعہ پھر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ تمہارا شوہر تم سے محبت نہیں کرتا۔ اس کو صرف اپنی ذات اور اپنے دائمی عیش سے محبت ہے۔

انیس نے اپنی جھکی ہوئی آنکھیں اونچی کیں اور تعجب سے گھور کر ادریسی کی طرف دیکھا۔

ادریسی۔ (زور دے کر) ہاں یہ سچ ہے! اسے نہ تم سے کبھی محبت تھی نہ اب ہے۔

انیس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ادریسی کے اس گمان پہ ناراض دل میں کہہ رہی ہے کہ "تو گدھی کمہار کی تجھے رام سے کیا کام" اے خواجہ سرا عشق و عاشقی کا مضمون تیرے بس کا نہیں۔ تجھے محبت کے کارخانہ میں کیا دخل۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔

ادریسی۔ (خفگی کے لہجہ میں) شوہر پرست بدقسمت عورت! میرے نظریہ سے تجھے اتفاق نہیں۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک سچا چاہنے والا شوہر اپنی چاہیتی بیوی کو قتل جیسی پرخطر اور ننگ وناموس کو تباہ کرنے والی مہم پر بھیجے؟

انیس نے اس کا جواب بھی نہ دیا۔ ادریسی چند منٹ اور اسی طرح کی باتیں کرتا رہا اس کے بعد وہ جیل کے مردانہ حصہ میں احمد کی کوٹھڑی پہ پہنچا۔ پہرے والے دُور دُور ہٹ گئے۔ احمد سر جھکائے

بیٹھا تھا۔ ادریسی کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

ادریسی۔ (تحکمانہ لہجہ میں) تم مسلمان ہو، اپنے پیغمبر کی شریعت پر چلنے کا تمہیں دعویٰ ہے انہی اعمال پر؟ احکام الٰہی کی اسی طرح تعمیل کرنی چاہئے کہ اپنی بیوی کو نامحرموں کے سامنے نچاؤ، اور پھر اسے قتل جیسے گناہ پر آمادہ کرو؟

احمد۔ ظل اللہ! میری عرض سنئے۔ آپ کا ارشاد بجا ہے۔ میں نے ایک اندھیری رات میں جبکہ میرے تصورات پر بجلیاں کوندرہی تھیں اور میری محبت اندھی ہو کر ڈونڈاتی پھرتی تھی ضرور ایسا کہا۔ میں خلیفہ کے قتل کی قسم کھا چکا تھا لیکن مجھے یہ ذرا بھی گمان نہ تھا کہ انیس اس سرعت کے ساتھ میری شب کی نیت کو جسے ایک پریشان خواب کہنا چاہئے اس طرح سچ کر دکھائے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ عورت جب کوئی بات ٹھان لیتی ہے پھر نہیں ٹلتی۔ اس کے دل کی گہرائیاں ناقابلِ پیمائش ہیں۔

ادریسی۔ (درشتی کے ساتھ) تعجب ہے۔ باوجود شوہر ہونے کے تم نے اس کی فطرت کا پورا مطالعہ نہیں کیا۔ اور تم جیسا مشہور شخص جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ عورتوں کے جذبات کی چوریاں کرنے میں گزارا ہو۔

احمد۔ (گھبرا کر) اس لئے کہ اس کے ساتھ محبت عشق کے درجہ تک پہنچ گئی ہے۔ عشق میں تمیز نہیں رہتی۔ خواب اور حقیقت، مذاق اور سنجیدگی سب یکساں نظر آتے تھے۔ آغاز و انجام، خیر و شر، موت و زیست صرف ایک انیس کی ذات میں دکھائی دیتی تھی۔

ادریسی۔ کیا بے تکی باتیں کرتے ہو۔ تمہاری خیالی عیاشیاں کھل چکی ہیں۔

احمد۔ (چونک کر) کیا فرمایا؟

ادریسی۔ (زور سے) میں یہ فرماتا ہوں کہ تمہیں انیس سے محبت نہیں، اتنی بھی نہیں جتنی ایک معمولی شوہر کو اپنی نکاحتا بیوی سے ہوتی ہے۔

احمد۔ جھوٹ! بالکل جھوٹ، میں انیس سے ایسی ہی محبت کرتا ہوں جیسی اپنی جان سے۔

محبت کے ایک تیر میں ہم دونوں کے دل چھدے ہوئے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے احمد کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا۔ ادریسی نے دیکھا کہ احمد اس کے رعب میں نہیں آیا بلکہ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی تحقیر کا جذبہ اور اس کے لفظ لفظ سے ادریسی کے خواب سرا ہونے کا طعنہ ٹپک رہا تھا۔ دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھنا غضب ہوتا ہے۔ اس کا غصہ بھڑک اٹھا۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر ان دونوں خود بینوں کو محبت کا مزہ نہ چکھایا ہو تو بات ہی کیا۔ دو انچھروں میں ان کی ساری شیخی کرکری ہوتی ہے۔

یہاں تو احمد اور ادریسی کے درمیان میں یہ آتش بازی چھوٹ رہی تھی۔ وہاں انیس کی روح کو تخیل کے جہنم میں عذاب ہو رہا تھا ایک طرف احمد کی محبت کا یقین، دوسری طرف ادریسی کے دانشمندانہ استدلال۔ اُدھر دل کے مطالبات ادھر عقل کے محکمات نہ اس میں شبہ کی گنجائش نہ اس میں کوئی دھوکے کی بات۔ کبھی آنکھوں کے آگے اندھیرا معلوم ہوتا کبھی اجالا۔ اجالے میں احمد کی غمگین صورت دیکھتی تو اندھیرے میں خلیفہ اپنا خوفناک عصا ہاتھ میں لئے نظر آتا۔ اس کے نیلے ہونٹوں پر ہنسی ہوتی اور ہنسی میں شرارت اس کے پیچھے ایک اور مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیتا۔ آنکھیں چمکاتا، تیوریاں بدلتا۔ یہ ادریسی کی تصویر پیش کرتا۔ لمحہ بہ لمحہ منظر بدل رہے تھے۔ آنکھ بند کی تو جنت کا سماں، احمد اور وہ گلے میں باہیں ڈالے پرانے قصے دہرا رہے ہیں۔ آنکھ کھولی تو جہنم کا اُدھڑ میدان سامنے ہے۔ خلیفہ اور ادریسی وہاں موجود، زقوم کے درختوں میں سے شعلے نکل رہے ہیں دہکتے ہوئے انگاروں کی بارش ہو رہی ہے۔ شیاطین آگ کے گولے بنے ہوئے ہر طرف اُچھلتے پھرتے ہیں۔

انیس نے یک دفعہ ہی دیوانوں کی طرح سر اٹھایا اور چلا کر بولی "تم جھوٹے ہو۔ بالکل جھوٹے۔ مکار، افترا باندھنے والے۔ کیا تمہارے چہرے دوزخیوں کے سے نہیں ہیں؟ احمد کو مجھ سے محبت ہے۔ محبت کیسی؟ عشق! وہ مجھ سے ایسی باتیں کرتا ہے جو صرف جنت کے رہنے والے ہی

کر سکتے ہیں۔ دنیا میں ایسی محبت کسی مرد نے کسی عورت کے ساتھ نہ کی ہوگی"

اسے ایسا محسوس ہوا کہ شیطان یہ سن کر قہقہے لگا رہے ہیں۔ آوازیں آئیں "ہاں سچ کہتی ہو۔ جب ہی تو احمد نے تمہیں قتل کرنے کے لئے بھیجا۔ تم سے یہ ثواب کا کام لیا۔ اپنی محبوبہ بیوی اور حسین معشوقہ سے اسی طرح وفاداری کا ثبوت لیا جایا کرتا ہے۔ کیا محبت کے یہی معنی ہیں؟ کہ وہ اسی سے جان لینے اور جان دینے کا مطالبہ کرے۔ ایک عورت ذات کی یہ آزمائش محبت ہے؟ محبت میں عاشق قربانیاں کرتے ہیں یا معشوق؟ اس نے تم کو صدقہ کا بکرا بنا دیا۔ پھر بھی تم کو اس کی محبت کا یقین ہے۔ چپ کیوں ہوگئیں۔ کہو جھوٹ! ہا ہا ہا ہا"

خیالی بھوت یا شیطان کے قہقہوں سے کوٹھڑی گونج اٹھی۔ انیس نے سر پکڑ لیا۔ کانوں میں انگلیاں دیں مگر وہ آوازیں خارج میں تو نہ تھیں جو نہ سنائی دیتیں۔ اس کا دماغ تصورات کی چونٹوں سے بول رہا تھا اور یہ صدائیں اس میں سے نکل رہی تھیں۔ وہ دائیں بائیں اوپر نیچے جس طرف نظر ڈالتی احمد کی خونی شکل دکھائی دیتی۔ قسم قسم کی ڈراونی آوازیں چلی آتیں۔ آخر ڈر کر ادھر ادھر دوڑنے لگی۔ خوف اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے چاروں طرف سے برقعہ لپیٹ لیا اور منہ بھی اس میں چھپا لیا۔ مگر خیال سے کہاں پناہ ملتی یہاں تک کہ وہ روحوں سے بچنے کے لئے اس طرح ہاتھ چلانے لگی جیسے کوئی کسی ہجوم سے لڑتا ہے۔

انیس کو اس شوریدہ حالت میں چھوڑ کر پھر احمد کی کوٹھڑی میں آجائیے۔ ادریسی غصہ میں ہونٹ چبا رہا ہے اور احمد سرنگوں۔

ادریسی۔ (چند لمحہ خاموش رہنے کے بعد) اے مردانہ جذبات کے گھمنڈی۔ محبت کے جھوٹے دعوے دار، خود فریب اور اپنے باپ دادا کی شرافت کو داغ لگانے والے انسان! تو سمجھا کہ تو نے کس طرح اپنے ضمیر کو گندہ کیا ہے۔ تجھے اور تیری بیوی کو محبت کا نام بھی زبان پر نہ لانا چاہئے۔ تم دونوں اپنے ناپاک خیالات میں ایسے مبتلا ہو جیسے کوئی دوزخ کی دلدل میں۔ میں اگرچہ ان صنفی تعلقات سے بالکل الگ ہوں۔ قدرت نے مجھے اس چیز ہی سے محروم کر دیا ہے جس سے

یہ جذبہ پیدا ہوتا۔ تاہم میں نے دنیا دیکھی ہے، حرم میں رات دن یہی تماشے ہوتے رہے ہیں میں سمجھتا ہوں اور میری نظر ایسے معاملات میں دور تک پہنچ سکتی ہے تمہاری مت ہلانہ زندگی نے جو انوکھی صورت اختیار کی اور جس نرالے ڈھنگ سے تم نے اپنی محبت کا ایک دوسرے پر اظہار کرنا چاہا کیا وہ وفا جوئی اور وفا شعاری کی وضع قطع تھی؟ جس شوہر کو اپنی بیوی سے محبت ہے اس کیلئے ضروری نہیں کہ وہ اس غریب سے بھی یہ مطالبہ کرے کہ وہ اسے کتنا چاہتی ہے۔ کیا ایک عورت کا ایک ہی مرد پر قانع ہونا اس کی محبت کا کافی ثبوت نہیں؟ پھر جب کوئی شخص اپنی بیوی کو خوبصورت سمجھتا ہے تو وہ مستقبل کا خیال کئے بغیر اس کی خوبصورتی سے محظوظ ہوتا ہے۔ اسے یہ ٹٹول نہیں ہوتی کہ دنیا میں اور بھی حسین ہیں، وہ کبھی اس وہم میں نہیں پڑتا کہ اس کی منظور نظر اور بلا شرکت غیرے حسین بیوی کے حسن کو زوال کا سامنا ہو گا۔ جن کی گھریلو زندگی خوشگوار ہے اور جو شریعتِ اسلامی کی تحقیر کرنا نہیں چاہتے۔ ان کی محبت پھلتی پھولتی ہے۔ گودیں بچوں سے بھر جاتی ہیں۔ دیکھنے میں تم دونوں تندرست ہو، چاہئے تھا کہ تمہارا شجر الفت ثمر لاتا۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری گود خالی ہے اور تم نہیں چاہتے کہ تمہاری محبت پھلے پھولے۔ یا تم نے زن و شوئی کے تعلقات ہی نہیں پیدا کئے، صرف ایک دوسرے کے جذبات ہی سے کھیلتے رہے اور قدرت کے منشا کو پس پشت ڈال دیا۔ ان تمام باتوں سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ تمہاری محبت، محبت نہیں بلکہ ایک بدعت ہے تو کیا حقیقت کے خلاف ہو گا؟

بار بار تم نے اپنی عیاشی کے باورچی خانہ میں اپنی بیوی کی خوبصورتی کے خیال کا سودا پکایا ہے۔ تم اس کو نہ صرف اپنی نگاہوں سے بلکہ دوسروں کی نظروں سے بھی جانچتے رہے ہو جس کا صاف یہ مطلب ہوا کہ وہ تمہارے دل میں محبت کا بیج ہی نہ بو سکی۔ اس کا جمال و کمال شروع سے آج تک جاگڑ ہی رہا اور تم صرف خیال سے اس کا لطف اٹھایا کئے۔ اس کی ذات سے اندرونی طور پر تم کبھی متمتع نہ ہو سکے۔ بلکہ ایک جوہری کی طرح جو اپنے بکری کے مال کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ تم نے محض اپنے گھمنڈ اور خام خیالی کی تسکین چاہی۔ اور جھوٹی نمود کے سامنے ایک لمحہ

کے لئے بھی سچی محبت کا خیال نہ کیا"۔

ادریسی کے الفاظ احمد کے دل و دماغ پر تیر و نشتر کا کام دے رہے تھے۔ وہ کچکچا کچکچا کر کبھی اپنے سر کے بال نوچتا، کبھی اپنی بوٹیاں کاٹتا۔ اسی اثنا میں ادریسی نے اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لئے یہ چال کھیلی کہ خفیہ طور پر انیس کو بلا کر برابر والی کوٹھڑی میں بٹھا دیا تاکہ وہ اپنے شوہر اور ادریسی کی باتیں سن سکے اور اسے احمد کی محبت کا اندازہ ہو جائے۔ جب ادریسی کو معلوم ہو گیا کہ انیس آ گئی ہے اور ہماری آواز سن سکے گی تو اس نے پھر کہنا شروع کیا "دو سال تک انیس نے تمہیں طرح طرح سے لبھایا، رجھایا۔ اپنی جوانی، اپنا حسن، اپنے ناز و انداز، جو کچھ اس کے پاس تھا تمہارے سامنے پیش کر دیا۔ مگر تم نے اس سے محبت نہیں کی۔ تمہاری آنکھیں آوارہ کی آوارہ رہیں۔ تم نے اس کی فطرت کو اپنے اوپر غلبہ نہ پانے دیا۔ اس کی قربانیوں کی مطلق قدر نہ کی۔ بلکہ سدا اس میں نت نئی تبدیلیاں کرتے رہے جس کا یہ نتیجہ نکلا ادریسی نکلنا چاہئے بھی تھا کہ بلندی پستی کی جانب اور پستی بلندی کی طرف مائل ہو گئی۔ پھر اس کے بعد تم ایک دوسرے رنگ میں نظر آئے اور جس رنگ میں تم نے اسے رنگنا چاہا وہ رنگی گئی، جو ناچ تم اسے نچاتے رہے وہ ناچتی رہی، اس کی آنکھ پہ میل تک نہ آیا۔ کیوں؟"

احمد۔ (سر اٹھا کر مغرورانہ) نہ آنا چاہئے تھا۔

ادریسی۔ آخر تمہاری اس کامیابی کا سبب؟

احمد۔ (فخریہ) میری محبت کا اثر!

ادریسی۔ (زور سے) کیا؟

احمد۔ ہاں، امیرالمومنین! ہاں میری محبت کا اثر! میں نے اس کے اندرونی جذبات کا جائزہ لیا اور اچھی طرح سمجھنے کے بعد ان کو روشنی میں لایا۔

ادریسی۔ (گرجتی ہوئی آواز میں) غلط، سرتاپا غلط! جھوٹ، سفید جھوٹ! راست باز محمود کے ناخلف مکار بیٹے! تو اور محبت؟ تو نے اس بیکس عورت کو اپنے پیر کی جوتی سمجھا۔ اسکی

وفا کو ٹھکرایا اور اس سے ذرہ برابر محبت نہیں کی۔ عاشق اپنا قیمتی وقت تجربوں میں ضائع نہیں کرتے۔ اپنی معشوقہ کو آزمائش میں نہیں ڈالتے۔

احمد۔ اگر یہ چیز غلط ہے تو میرے تجربات کیوں کامیاب ہوئے؟

ادریسی۔ صرف اس لئے کہ اسے تمہارے ساتھ محبت تھی۔ قانون شریعت نے اس کو تمہارا بنا دیا تھا۔ اس نے ایک مسلمان عورت کی طرح اپنی اصلی زندگی تم پر نثار کر کے تمہاری بخشی ہوئی مصنوعی زندگی اختیار کر لی۔

احمد۔ کیا وہ جب میرے گھر آئی ایک شاخ تھی۔ جس کو میں نے سینچا۔ اس کے حسن کی دیکھ بھال کی۔ دھوپ کی ضرورت ہوئی دھوپ دی۔ سایہ کی حاجت ہوئی سایہ میں رکھا۔ پھر کیا وہ میری نگرانی میں پھول کی طرح رنگ و بو سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس میں پریوں کے انداز اور حوروں کی شان نہیں نکلی؟

ادریسی۔ یہ تمہاری کارگزاری تھی؟ تم اس کو اپنی باغبانی سے منسوب کرتے ہو؟ خدا کی مہربانی نہیں کہتے۔ یہ ہونہار برد' اچھی نسل کا پودا' باد مخالف کے جھونکوں کے باوجود سرسبز رہتا ہے۔ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ دشمن کے ہاتھوں اس کی پرورش ہوتی ہے۔ دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست' اس کی قسمت میں نشوونما پانا تھا' پایا۔ انیس کو تمہاری بوالہوسی کے جال میں اپنی شان جمالی دکھانی تھی دکھائی۔

احمد۔ لیکن۔

ادریسی۔ لیکن کیا؟ آخر تم ہار گئے۔ انیس نے تمہیں تھکانا شروع کیا:۔

احمد۔ (انکار کے طور پر گردن ہلا کر) یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟

ادریسی۔ (زہر خند کے ساتھ) میرے دوست! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یقین مانو کہ اس نے تم کو تھکا دیا۔ اور تم تھک کر کھسیانے ہو گئے۔

احمد۔ میں کیوں کر کہوں کہ مجھے انیس سے محبت تھی اور محبت تھکا نہیں کرتی۔

ادریسی۔ محبت ممکن ہے نہ تھکتی ہو مگر تم تھک گئے۔

احمد۔ پریشان ادہر ادہر دیکھنے لگا۔

ادریسی۔ کیا تم نے دو سال سے بھی کچھ زیادہ ہی اس کی زندگی کا مطالعہ کرنے میں نہیں گزارے۔ مطالعہ بھی نہایت گہرا؟ اور کیا اُن دنوں میں تمہاری محبت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی نہیں رہی؟

احمد۔ صحیح ہے، امیرالمومنین بالکل درست فرما رہے ہیں۔

ادریسی۔ وہ زمانہ تمہارے انتہائی شوق اور محبت کے میدان میں مٹھیاں باندھ کر دوڑنے کا نہیں تھا؟ تم دونوں ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ تم نے اپنی دل لگی کے لئے اسے تیز دوڑایا۔ وہ برابر تمہارے اشاروں پر دوڑتی رہی۔ آخر تم کو ماندگی محسوس ہونے لگی۔ اور تمہیں دم لینے کے لئے بہانہ کی تلاش ہوئی۔

احمد۔ میں کبھی اس کے ناز و نیاز سے نہیں اکتایا۔

ادریسی۔ اس میں تنوع تو چاہا!

احمد۔ مختلف جلوے دیکھنے میں کیا نقصان تھا؟

ادریسی۔ (مسکرا کر) تمہارے تھک جانے اور اس کے تم کو تھکا دینے کا یہی تو ثبوت ہے۔

احمد۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ مجھ کو اس پر قناعت نہ تھی یا خدانخواستہ اس میں مجھ کو عیب نظر آنے لگے تھے۔

ادریسی۔ یہ دوسری بحث ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی اپنی ذات میں کوئی برائی نہ ہو۔

احمد۔ جب اس کی ذات میں کوئی برائی نہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ میرا دل اس سے بھر گیا تھا۔

ادریسی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔

احمد۔ ایسی صورت میں ایک مسلمان کے لئے جو مجھ جیسا دولتمند بھی ہو۔ دوسری تیسری اور چوتھی بیوی کرنے میں کونسی رکاوٹ تھی۔

ادریسی۔ لیکن تم ایسا نہ کرسکے۔ تم نے اپنی فطرت کی کمزوریوں کو محسوس ہی نہیں کیا۔

احمد۔ امیرالمومنین! کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص بت کا بار اٹھائے اور اس کی گرانی یا سُبکی محسوس نہ کرے؟

ادریسی۔ خدا کے بندوں میں بہت سے محبت سے بے خبر رہتے ہوئے بھی محبت کرسکتے ہیں۔ نفرت کرنے کے لئے نفرت کی حقیقت جاننا ضروری نہیں۔ اللہ جل شانہٗ سے بڑھ کر بھی کوئی ہستی ہے؟ مگر دیکھ لو دہریئے اس سے منکر ہو کر اپنے آپ کو کس طرح راہِ راست پر سمجھتے ہیں۔ سینکڑوں خدا پرستوں کا رویہ کس قدر شانِ الوہیت کو بٹہ لگانے والا ہوتا ہے۔ ذرا سا مافوق الفطر جلوہ دیکھا اور سر جھکا دیا۔ دنیا مکر و فریب کی تماشہ گاہ ہے۔ یہاں دھوکے ہی دھوکے ہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان کو برابر اپنے دام میں پھانس رہا ہے۔ آپس میں برابر داؤں بازیاں چل رہی ہیں۔ اور یہی نہیں کہ دوسروں ہی کو فریب دیا جائے۔ ہر شخص اپنے نفس کو اپنے جذبات کو اور اپنے ضمیر کو بھی دھوکا دیتا ہے۔ بلکہ اوروں کو دھوکا دینے کیلئے تو چرب زبانی، ہوشیاری کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں یہ بھی نہیں۔ خیال کیا، تصور باندھا اور فریب کا جال تیار۔ نہ وقت کی قید نہ مخالفت کا ڈر۔

ادریسی یہ کوئی نئی دنیا سے نرالی باتیں نہیں کہہ رہا تھا۔ سب سچ تھیں تاہم احمد کو ایسا معلوم ہوا کہ ادریسی اسے کسی ایسی منزل پر لے جا کر چھوڑنا چاہتا ہے۔ جو نہایت خوفناک ہے۔ اور اسے اپنا صحرا کا سفر یاد آگیا کہ کس طرح اس نے اپنی بیوی کے حُسن کو غیر فانی بنانے کے لئے زمین و آسمان کو ہلا ڈالا تھا۔ اور وہاں کیا گزری تھی۔ احمد کو یکایک خیال آیا کہ وہ سارا قصہ ادریسی کو سنا دینا چاہئے شاید اسے ہماری محبت کا یقین آجائے چنانچہ سنسان صحراؤں کے سفر کے تفصیل وار سارے حالات سنا دئے۔ لیکن ادریسی ایک کائیاں۔ ایسی جرح اور قدح کی کہ احمد کھسیانا ہو گیا۔ اس کے ہر دعوے کو دلیل سے توڑ دیا اور اپنی بات منوالی۔

ادریسی۔ میرے کانوں کے لئے یہ افسانہ نیا نہیں۔ جب انیس خلیفہ کی بارہ دری میں آئی

تھی۔ میں نے اس سے ہمدردی ظاہر کی۔ واقعی میرے رحم وکرم کا جذبہ اس کے ساتھ تھا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ میری صداقت کا اثر قبول نہ کرتی۔ اس نے اگلے پچھلے سارے واقعات میرے سامنے دہرادئے تمہارے اس سفر کے افسانے بھی میں اسی کی زبانی سن چکا ہوں اور اسی وقت سے میں نے یہ سمجھ لیا کہ اس عورت سے جمال و کمال کے ساتھ اس کی بدنصیبی میں بھی شک نہیں۔

احمد۔ کیا آپ کے نزدیک وہ عورت جس کا شوہر اس درجہ محبت میں دیوانہ ہو بدنصیب ہو سکتی ہے؟

ادریسی۔ افسوس تم نے اپنے اعمال کا جائزہ نہیں لیا۔ خود فریبی میں برابر مبتلا ہو۔ (لہجہ بدل کر) اپنے ضمیر کو دھوکا دینے والے انسان! تیری نفسانی خواہشات خلیفہ کی ذلیل حرکات سے بھی گئی گزری ہیں۔ تو اس سے کہیں زیادہ سیہ کار اور گنہگار ثابت ہوتا ہے۔ تو نے اپنی درماندگی اور زندگی کی ہم آہنگی سے بچنے کے لئے قدرت کے ساز کا ٹھاٹ بدلنا چاہا۔ اس کے پردوں میں بھی تبدیلی چاہی۔ تو نے اپنے سُروں میں اپنی بے وقت کی راگنی الاپنی شروع کی اور اسے موسیقی سمجھا۔ ظالم! یہ کونسا نغمہ تھا جس کی سنگت کیلئے تو اپنی بیوی کو ریگستان کی سرابی دنیا میں لے گیا اور پھر اسے اکیلا چھوڑ دیا۔

احمد۔ محبت قربانی چاہتی تھی۔

ادریسی۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ قربانی بھیڑ کی ہو بھیڑئے کی نہیں؟

احمد۔ (خاموش)

ادریسی۔ سنگدل! ایک نیک شعار بیوی کے ساتھ ایسا ہی ظالمانہ سلوک کیا کرتے ہیں؟ اس بیچاری کو سنسان ریت کے ٹیلوں میں دفن ہوجانے کے لئے ننگا بُچا کر کے دھکیل دیا۔ خدا کا خوف نہ آیا۔ محبت کی دیوی کی بھینٹ چڑھانے کو ایک عورت ہی رہ گئی تھی۔

احمد۔ جہاں پناہ! یہ بات نہیں۔ میں اسے تباہ کرنا تو نہیں چاہتا تھا۔

ادریسی۔ (طعن سے) تو کیا جناب اس کو جنت کی حور بنانا چاہتے تھے؟

احمد۔ (دھیمی آواز میں) جی ہاں! اس کے سر پہ بقا کا سایہ ڈالنے کی میری خواہش تھی۔

ادریسی۔ شاباس! وہاں چشمۂ آبِ بقا ہوگا؟ پھر کیا ہوا؟

احمد۔ افسوس! ہم نے اپنا مقصد پالیا تھا مگر یہی دستِ قسمت نے یہ سودا نہ رہبر کامل۔

ادریسی۔ غلط کار شخص! قسمت کو بدنام نہ کر۔ تو نے جیسا اپنے نفس شیطان کو اپنا رہنما بنایا ویسا ہی نتیجہ پایا۔ چور کے بھٹکنے میں کر جیلخانہ کے سوا کسی دوسری منزل پر پہنچ سکتا ہے؟

احمد۔ میری رہنما تو صرف محبت تھی۔

ادریسی۔ مسخرے! کیوں قدرت کے انعام کی تحقیر کرتا ہے!! آج تک بھی کسی نے ایسی بکواس نہ سنی ہوگی۔ ہزاروں برس سے دنیا آباد ہے۔ بڑے بڑے جگادری جادوگر، حکیم اور خدائی کا دعویٰ کرنے والے بادشاہ گزرے ہیں پیغمبروں اور ولیوں سے بھی کوئی انسانی آبادی خالی نہیں رہی۔ لیکن کوئی روایت دیکھی۔ کہیں سنا کہ قانونِ فطرت میں کوئی تصرف کرسکا ہو۔ قرآن مجید جو ہم مسلمانوں کے عقیدہ میں حکمت الٰہی کی جامع اور آخری کتاب ہے۔ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم جن پہ عمل کئے بغیر ہمارے ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ان میں کیا اس مسئلہ کی تشریح ہے؟ غالباً اللہ تعالیٰ نے خفیہ طور پہ تجھے القا کیا ہوگا؟

احمد۔ (کانپ کر) حاشا!

ادریسی۔ پھر ایک فانی ہستی غیر فانی شکل میں کس طرح بدلی جاسکتی؟

احمد۔ محبت کے جوش میں ان باتوں پر میں غور ہی نہیں کرسکا۔ مجھے میرے تصورات نے اندھا کر رکھا تھا۔

ادریسی۔ نہیں! تم جو کچھ کر رہے تھے دانستہ کر رہے تھے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہاری محبت دھوکہ تھی؟

احمد۔ اللہ انصاف کرنے والا ہے۔

ادریسی۔ بہرحال جس قسم کی حرکات تم سے سرزد ہوئی ہیں ان کی تنقید کرنے کے بعد میں

اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تم اپنی خواہش دوسرے رنگ میں پوری کرنی چاہتے تھے۔ تمہارا یہی منشا تھا کہ انیس کا حسن لازوال ہو جائے؟

احمد۔ خدا امیر المومنین کی عمر میں برکت دے!

ادریسی۔ مگر بالکل اسی طرح جیسے کسی دھوپ میں خشک ہو جانے والے پھول کو کوئی سمندر میں جھونک دے۔

احمد۔ کیا آپ کا قیاس ہے کہ میں اپنی بیوی کا دشمن ہوں۔

ادریسی۔ بیشک! بلکہ یقیناً ہو۔

احمد۔ یعنی ہمارا وہ صحرا کا سفر جناب کے نزدیک میری بدنیتی پر دلالت کرتا ہے؟

ادریسی۔ میری رائے تو یہی ہے۔ تم اپنی بیوی کو لافانی نہیں بلکہ قبل از وقت فانی بنانا چاہتے تھے۔

احمد۔ (حیرت سے) آخر اس کی موت سے میرے ہاتھ کیا آتا؟

ادریسی۔ نئی بیوی، تازہ شکار۔ تم کو اپنی زندگی کا پرانا آزاد طریقہ یاد آتا تھا مگر اس نئے جال سے بھی نکلنے کی کوئی معقول صورت نہ تھی۔ اس لئے کہ انیس نے تمہاری محبت کے سارے رستے بند کر دئے تھے۔

احمد۔ واللہ! اتنا بے رحم اور سخت دل میں نہیں ہوں۔

ادریسی۔ ڈاکو، خونی، قاتل کوئی بھی اپنے آپ کو ظالم نہیں کہتا۔ نہ اپنے فعل کو جور و ستم سمجھتا ہے اور تمہاری نسبت میرا یہ خیال تو نہیں کہ تم اس کی گردن مارنے لے گئے تھے، تم میں اتنی اخلاقی جرأت کہاں؟ تمہارا تو منشا یہ تھا کہ کسی طرح خود بخود شہد سم ہو جائے۔ ملک الموت اوپر ہی اوپر اچک لے اور تم تھوڑی دیر جزع فزع کر کے پھر حسن کا سودا کرنے بازار نکل جاؤ۔ یہی سبب تھا اور اسی سے تمہاری بزدلی اور تلون مزاجی ثابت ہے کہ جب اس شریف اور حسین، نوجوان اور بہادر عورت نے ہر میدان میں تم کو بھگا دیا اور تم اس کی انتھک اطاعت، بے عذر

وفاداری سے عاجز ہو گئے۔ اتفاق سے سفر کی صلاح ٹھہر گئی تاکہ منتشر خیالات یکسو ہوں۔ چاہیے تھا کہ بارونق شہروں کی سیر کرتے، دل بہلتے۔ تم نے صحرا کا رخ کیا۔ اپنے اسی نظریہ کے تحت میں۔ پھر تم نے اس کو برہنہ کر کے تپتے ریگستان میں چھوڑ جانے کا کہا، وہ چل گئی۔

احمد۔ جلدی سے بات کاٹ کر مگر اس وقت جو میرے قلب کی حالت تھی اس کا آپ کو اندازہ نہیں!

ادریسی۔ ہاں! تم انتہا درجہ کے ڈرپوک ہو۔ تم پر یہ خوف غالب آ گیا کہ کوئی جن یا بھوت اس میں نہ سما جائے یا اگر وہ زندہ رہی اور میری بے تعلقی اس پر کھل گئی تو تمہارا سارا گھمنڈ خاک میں مل جائے گا۔ اس لئے تم مجبور تھے کہ اس کی خبر لو اور اس کے ساتھ چالاکی سے پیش آؤ۔

احمد سر در گریباں ادریسی کی تقریر سن رہا تھا۔ یہاں تک جب گفتگو پہنچی تو اسے اس خوف کا تصور بندھ گیا جس نے ریگ کے ٹیلوں میں انیس کی نظروں سے غائب ہونے کے بعد اس کے حواس باختہ کر دئے تھے۔ وہ کانپنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ بھوت اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں سانس لینا مشکل ہو گیا۔

ادریسی آیا انیس شریف ہیں۔

احمد: (ہکلاتے ہوئے) اے امیر المومنین! اے لیکن۔ اور اس پر لگیے۔ میری محبت کا اثر نہ تھا تو اس نے یہ بے زحمت کیوں برداشت کی۔

ادریسی۔ ایک محبت کی ماری، شریف گھر کی بیٹی، شرعی رشتوں سے بندھی ہوئی عورت سب کچھ برداشت کرتی ہے، مرد کی جادوگریوں کا اسے احساس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی وفاداری اور محبت کا یقین دلانے کے لیے ہر خطرہ میں پڑنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

احمد کا دماغ چکرایا جاتا تھا، اس کے تخیل کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ واقعات کی تصویریں ایک کے بعد ایک چلی آ رہی تھیں۔ یکایک صحرا کا منظر ادریسی کے جبہ کی سلوٹوں میں سے پیدا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ہم واپس ہو رہے ہیں، انیس پشت کے پیچھے بیٹھی ہوئی ہے۔ آدھی دور نکل آئے

تو وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "احمد میری محبت کا تمہیں یقین آیا؟" جواب ملا "مجھے کب یقین نہ تھا" پھر اس نے پوچھا "کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟" اس نے ایک فریبی کی طرح کہدیا "کیوں نہیں، تم میری بیوی ہو۔"

اس خیال کے آتے ہی احمد اپنے دل کی "جو فروش گندم نما" دنیا میں شرم سے گڑ گیا۔ اس نے خوفزدہ ہو کر ادریسی کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرہ پر حکومت کا جاہ و جلال برس رہا تھا۔

ادریسی۔ (تیوری چڑھا کر) حسن و عشق کے جھوٹے دوکاندار! تو ان مقدس جذبات کو بھی سوداگری کا مال سمجھتا رہا۔ تو نے اپنی معصوم بیوی کو اس الٰہی منشا کے تحت میں نہیں بھیجا تھا جس کی تعمیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی اور ہمارے قبیلے کی ماں ہاجرہ کو اپنے بیٹے اسمٰعیل کے ساتھ وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آنے سے کی تھی۔ بلکہ تیرے ارادے شیطانی تھے۔ تو نے غیروں کے سامنے اس کی نمائش کی۔ اپنے تعیش کی تسکین کے لئے اسے جمال و کمال کا مجسمہ سمجھا۔ اس کی عفت و عصمت سے اپنی دوکان سجائی۔ وہ تو اس کی اسلامی حمیت اور محبت نے اسے بچائے رکھا ایک تیرے خیال نے اس کو ہر طرف سے محفوظ کر دیا تھا۔ ورنہ حسن کے ڈاکو کبھی کے تیری ناموس لوٹ لیتے۔

احمد۔ بہر حال محبت کارفرما ہی۔

ادریسی۔ مگر کس کی؟ تیری یا اس کھوٹے نصیب والی کی؟ شیطان! تجھے محبت کا نام لیتے شرم نہیں آتی۔ بدبخت محبت کا درجہ بہت بلند ہے۔ تو نے تو اس کی تذلیل کی اور اس کے غلط استعمال سے جہنم کا راستہ اختیار کیا۔

احمد۔ (کانپ کر) امیر المومنین۔

ادریسی۔ بس خاموش! دوزخ کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے اور آنکھیں نہیں کھلتیں۔ کیا ابھی تیرے دماغ سے محبت کا وہم دور نہیں ہوا؟ تو اپنے خیال میں سمجھے ہوئے ہے کہ تو نے انیس سے محبت کی؟

احمد- میں نے اس کی خوشی کے لیے، اس کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا!

ادریسی- نادان! تو نے جو کچھ خوشی اس کے لئے بہم پہنچائی کیا اس میں کوئی روح تھی؟ بالکل مردہ، محض نمائشی! تو اپنی حسین، باکمال مگر بدبخت بیوی سے زیادہ ادنیٰ طبقہ کے بازاری لوگوں، میلے کچیلے، جاہل پھیری والوں کی خاطرداری کرتا رہا۔ تو اُن ذلیل اشخاص کا شرمندۂ احسان ہوا، صرف اس لیے کہ وہ تیری بیوی کے حسن کی تعریف کریں۔ ایسی تعریف جس سے تو ناآشنا تھا۔

احمد- کیا مجھے اس کے دیکھنے سے خوشی نہیں ہوتی تھی؟

ادریسی- ہوتی ہوگی! مجھے انکار نہیں، لیکن ادریسی، محض اس بنا پر کہ اس نے تمہارے لئے بے نقاب ہو کر بغداد کے اجلاف کی تفریح کا سامان بہم پہنچایا۔ تمہارا مکان اندر کا اکھاڑا مشہور ہوا۔ کہانیاں بنائی گئیں اور تم دونوں کی نسبت شہر والے حیرت میں پڑ گئے۔

احمد- تاہم محبت سے انکار تو نہیں ہو سکتا۔

ادریسی- تو نے شاید اپنی اپنی حماقتوں کو محبت سمجھ رکھا ہے۔ بے غیرت! تو جسے محبت کہتا ہے میں اسے محبت کی توہین کہتا ہوں۔ اس سے زیادہ تو کسی عورت سے محبت ہی نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ انیس ہو یا اس دنیا کی دوسری لڑکیاں۔ تیری محبت کا معیار سیاہ کاریوں کی تاریکیوں میں گم ہو چکا ہے۔

احمد خاموش دل میں کٹا جاتا تھا۔ اس کی دھندلی آنکھوں کے سامنے گزشتہ اعمال کی تصویر پر تصویر چلی آتی تھی۔ اس نے آج پھر جاگتے ہوئے وہ خواب دیکھا جو انیس کی جان پہچان سے پہلے سوتے میں دیکھا تھا کہ ایک آراستہ حجلہ میں، کوئی مست شباب لڑکی، سر سے پا تک کرشمۂ حسن۔ آنکھیں نرگسِ شہلا۔ رخسار گلاب کے دو شاداب پھول۔ ماتھا چاند کا ٹکڑا۔ سرو قامت، ہونٹوں پہ تبسم، کھڑی ہے۔ حیران، پریشان، ڈرا، جھجکا کہ کہاں آگیا؟ حرم سرائے شاہی میں تو نہیں چلا آیا خدا پناہ میں رکھے آج خیر نہیں۔ اب اس نے دستک دی اور حبشی و ترک غلام تلواریں سونتے آئے

لاش دجلے میں تیرتی ہوئی نظر آئے گی. کوئی آن میں ترکی تمام ہے. خوف سے آنکھیں بند ہوگئیں. ہاتھ پاؤں میں رعشہ آگیا. ایک ایک لمحہ قیامت تھا. گھبرا کر جو آنکھ کھولی تو سبحان اللہ، غیر کا کیا کام مکان تو اپنا ہی ہے. نظر کو دھوکا ہوا. کوئی چیز پرائی نہیں. اپنی خوابگاہ، اپنے لوازمات اور وہ پیکر حسن و شباب بھی اپنا ہی مال ہے. غیریت کیسی اور اجنبیت کیا؟ دل میں لاحول پڑھ کر خوش ہوگیا. ہاتھ پکڑنے والا کون تھا، بلا تکلف اس کی طرف بڑھا کہ آغوش میں لوں. کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی. یکایک پہلو کا دروازہ کھلا اور ایک سجیلا نوجوان شریفوں کا سا عمدہ لباس پہنے، سر پہ نیلے رنگ کی بانکی ٹوپی اوڑھے داخل ہوا. نہ ادھر دیکھا نہ ادھر سیدھا لڑکی کے پاس آیا اور نہایت اطمینان کے ساتھ اس کی بیٹی جس میں زمرد جڑے ہوئے تھے کھول ڈالی وغیرہ وغیرہ. خدا جانے اور اسی قسم کی کتنی گفتنی اور ناگفتنی باتوں کے تصور نے احمد کو گم سم کر دیا تھا. اس کے ضمیر کی عجب کیفیت تھی. اپنے گھر اپنی خلوت گاہ میں ایک اجنبی کا دخل، وہ بھی اپنا ہی جیسا حسین، رنگین مزاج، بدنظر نوجوان پھر اپنی منکوحہ بیوی کے ساتھ اس کی دست درازی، خواب میں سہی، مانا کہ واہمہ کی کارستانی تھی ہوئی تو بے عزتی. فال تو بری نکلی. لیکن اس کے دیدے کچھ ایسے دھوئے دھائے تھے کہ جب سو کر اٹھا ہے تو نہ اس کی آنکھوں میں رقابت کی جلن تھی نہ چہرہ پر ملال کے آثار.

آج سے پورے ایک برس ایک دن پہلے احمد نے یہ خواب دیکھا تھا اور اپنے دل سے جو اس کی تعبیر لی تھی اب اس کی تعبیر کسی دوسرے رنگ میں نکلتی ہوئی معلوم ہوئی. زندگی خواب پریشاں نظر آنے لگی. پیشانی پہ ٹھنڈا پسینہ آگیا. کانو تو لہو نہ تھا بدن میں، ادریسی کے قدموں پہ گر پڑا. گڑگڑا گڑگڑا کر کہنے لگا "امیر المومنین خدا کے واسطے اور کچھ نہ فرمائیں. میں نے اپنے کئے کی سزا پائی"۔

ادریسی۔ اے محمود کے ناخلف بیٹے! بغداد کے مکار جوہری، شریعت محمدی کے دشمن! بتا کیا تجھے اپنی بیوی سے محبت ہے؟

احمد۔ (دست بستہ) نہیں، یا امیر المومنین! نہیں ہرگز نہیں!! مجھے انیس سے نجات ہے

نہ کبھی تھی۔

لیکن ادریسی ابھی مطمئن نہیں تھا۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ احمد زیادہ صاف الفاظ میں محبت کے عدم کا اظہار کرے۔ جس میں جبر و اکراہ کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ اس لئے اس نے پھر ذرا سخت لہجہ میں کہا۔ ہاں تمہیں انیس سے محبت نہیں ہے۔ تم اس سے نفرت کرتے ہو۔ تمہاری زندگی اس کے لئے خطرناک ہے۔ تم اس کے پہلو میں سانپ ہو، زہریلے سانپ۔ تم نے نیچ قوموں کے بدتمیز لوگوں میں اسے بے عزت کیا۔ ایک ادنیٰ کنیز سے بھی زیادہ اس کی تذلیل کی۔ تمہیں اس کو بے عصمت کرنے کے بعد بھی صبر نہ آیا۔ آخر خونی مجرم قاتلہ بنا کر چھوڑا۔ اللہ کی پردہ پوشی ختم ہوئی۔ وہ ساعت آ گئی ہے کہ وہ تم کو تمہارے اصلی رنگ میں دیکھے۔ تم نے جو کچھ کیا بہت برا کیا۔ سوچو تو اسے زندہ رہنے کی تمنا ہو سکتی ہے۔ جب اس کے سامنے یہ بھیانک حقیقت کھل گئی اور تم اس کی آنکھوں کے سامنے بجائے عاشق کے بوالہوس بن کر آئے۔ اور تم کو اس نے انسان کے لباس میں شیطان پایا۔ افسوس! اس نے عورت ذات ہونے کے باوجود مردانہ وار تمہاری جھوٹی محبت کے سامنے سر جھکا دیا۔ تمہیں خوش کرنے کیلئے اپنی جان تک کی پروا نہ کی، اور تم مرد ہو کر عاشقی کا دم بھرتے ہوئے برابر اپنی طاقت آزماتے رہے۔ جس لمحہ اس وفا شعار، اطاعت گزار، محبت کی فریب خوردہ، قسمت کی ماری عورت کو تیری گزشتہ حالت اور تیرے کرتوت کا یقین ہو گیا تو اے لعنتی انسان! تو ہی بتا وہ زندہ رہ سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، ایک شریف انسان کسی امید پر جیا کرتا ہے۔ امید ٹوٹی اور اسے موت کی ہچکی آئی۔ پھر عورت جیسی نازک اور شوہر کی طرف سے ایسا گھناؤنا سلوک! معاذ اللہ!! وہ فوراً اپنی جان کھو دے گی۔ بول؟ اے جہنم کے کندے! بول۔ اس غریب کا خون کس کی گردن پر ہوگا؟ تیرے نزدیک لوگ اسے شہید محبت کہیں گے یا قتیل یاس؟

. . .

یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر چھوڑنے کے بعد ادریسی نے دیوار پر ہاتھ مارا۔ وہ دیوار نہ تھی پردہ تھا جس کے پیچھے دوسرے دروازہ سے لا کر انیس بٹھا دی گئی تھی۔ اس تماشے کے مناظر اس نے اپنے ذہن میں اس طرح ترتیب دئے تھے کہ جب گفتگو کا نتیجہ حسب منشا نکل آئے یعنی احمد منطقی دلائل میں گھر کر یا اپنے بچاؤ کی خاطر خلیفہ کے نظریہ کی تائید کرتے ہوئے انیس کی محبت سے انکار کر چکے تو فوراً پردہ اٹھا دے

اور پھر ان دونوں کے جذبات کے آپس میں ٹکرانے کی سیر دیکھیے۔

ادریسی کو خیال تھا کہ انیس پردے کے اس طرف کھڑی اپنے شوہر کا اعمال نامہ اپنے کانوں سے سن رہی ہوگی اور پردہ اٹھتے ہی وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح جھپٹے گی اور اگر اس کا پنجہ نہ بھی اٹھا تو زبان کے وار کون روک سکتا ہے۔ لیکن بندے اور خدا میں یہی تو فرق ہے' یہ مجبور' وہ مختار۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور یہ سانس لینے پر بھی قادر نہیں۔ ادریسی امیر المومنین' بغداد کا خلیفہ سہی۔ سارا کیا دھرا۔ جتنے منصوبے تھے سب یونہی رہ گئے۔ پردہ ہٹتے ہی کیا دیکھا کہ انیس جلیس فرش پر بے حس و حرکت اور ایک انگوٹھی نگ اکھڑی ہوئی پاس پڑی ہے۔ پرانے خاندانوں میں یہ دستور تھا کہ انگوٹھیوں میں نگینوں کے نیچے کوئی قاتل زہر رکھا کرتے تھے تاکہ جب آبرو پر بن جائے تو اس سے کام لیں۔ انیس کے قبضہ میں بھی غالباً اسی قسم کی کوئی چیز ہوگی۔ اس سے بڑھ کر اس کے لئے برا وقت کونسا ہوتا کہ جسے وہ اپنا عاشق اور اپنی محبت کا محافظ سمجھی ہوئی تھی' بوالہوس اور دشمن ایمان نکلا۔ وہ احمد کے منہ سے انکار محبت کا لفظ سن کر کیا تاب لاتی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوگئی زندگی کا کوئی حاصل نظر نہ آیا۔ بغیر اُف کئے خاموشی سے جان دے دی۔

احمد کا یہ فقرہ کہ "مجھے انیس سے محبت ہے نہ کبھی تھی" انیس کے حق میں ملک الموت ہوگیا۔ جب تک دھوکے میں رہی ہر بلا کا مقابلہ کیا۔ احمد کا پردہ فاش ہوتے ہی' جینے کے سارے آسرے ایک دم فنا ہوگئے۔ گویا محبت ایک اڑواڑ تھی ہٹتے ہی ساری عمارت آپڑی۔ لیکن محبت کی موت نے اس کی زندگی کو چار چاند لگادئے۔ اس کا حسن و جمال پہلے سے زیادہ چمک اٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنت کی کوئی حور حشا شین کے مصنوعی باغ عدن کا خواب دیکھتے دیکھتے آرام کی نیند لے رہی ہے۔

ادریسی کے رُعب میں آکر یا اس کی تقریر کے زور سے' احمد نے کچھ بھی کہا۔ اُسے خلیفہ کے دلائل کے آگے سر جھکانا پڑا لیکن فی الحقیقت اس کے دل میں انیس کی محبت تھی اس سے بحث نہیں کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کس طرح کرتا رہا۔ جب اُس نے انیس کو مردہ پایا انیس کو نہیں بلکہ اپنی محبت کی پتلی کو زمین پر بے جان پڑے ہوئے دیکھا تو اس کی نظروں میں زمین و آسمان سیاہ

ہو گیا۔ کپڑے پھاڑ ڈالے بال نوچنے لگا۔ کبھی چھاتی پر گھونسے مارتا۔ کبھی دیواروں سے سر ٹکراتا۔ بس نہیں چلتا تھا کہ انیس کے پہلو میں لیٹ کر دم دے یا ادریسی کو پچھاڑ کر اس کا خون پی لے۔ اس کے کلیجے میں ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ ایک جان سے عاری، مایوس زندگی انسان کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ وہ دانت کچکچا کر ادریسی کی طرف بڑھا اور چلا کر کہنے لگا: "ناخدا ترس خوفناک آدمی! یہ تو نے کیا کیا؟ آہ! جنگل کے وحشی سے وحشی درندے بھی ایسا ظلم نہیں کریں گے۔ محبت کی جنت تو نے اجاڑ دی۔ صنعت خالق کے جیتے جاگتے شاہکار کو مٹا دیا۔ بے رحم انسان آخر تیرے ہاتھ کیا آیا۔ گناہگار میں تھا۔ مجھ کو سزا دینی چاہیے۔ اس معصوم نے تیرا کیا بگاڑا تھا (ادریسی کو قہر آلود آنکھوں سے دیکھ کر) اب کیا دیکھتا ہے۔ جلاد کو بلا۔ قاضی کے سامنے مجھے پیش کر۔ ان سے کہہ دے کہ یہ خلیفہ کا قاتل ہے۔ میں اپنی زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔ انہیں اختیار ہے جس قسم کی سزا چاہیں دیں، سولی پر چڑھائیں، سنگسار کریں یا تھوتے تیروں اڑائیں۔ تمہیں قانون پورا کرنے اور اپنے آپ کو مخلوق کی نگاہوں میں بے تعلق ثابت کرنے کے لئے ایک ملزم کی ضرورت ہے میں بدنصیب حاضر ہوں۔ مجھے اقرار ہے اور اپنے اقرار سے کبھی نہیں پھروں گا۔

ادریسی نے احمد کی بھڑاس نکلنے دی۔ خاموش کھڑا سنا کیا۔ ایسی صورت میں کہ اس کے تمام منصوبے کامیاب ہو چکے تھے، سیاہ کاریوں کا اصلی گواہ اس کے قدموں میں بے جان پڑا تھا۔ یہ بھی اندیشہ نہیں رہا تھا کہ مرحوم خلیفہ کی روح اپنے قاتل کی تلاش میں بھٹکتی پھرتی ہو گی۔ خون کا بدلہ خون، قدرت نے اپنا قانون جاری کر کے قصاص لے لیا اور اب اسے اپنی خلافت اور حکومت کے لئے دوسرے معاملات میں انہماک کی ضرورت تھی۔ حقیقت میں ادریسی نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ باتوں سے تلوار کا کام لیا۔ دنیا میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ فرماں روائی میں اس قسم کی سیاسی چالیں جائز رکھی گئی ہیں۔

احمد پچھاڑ کھا کر زمین پر گر پڑا تھا۔ تڑپتے تڑپتے وہ انیس کی لاش کے قریب پہنچا جو ابھی سانس لیتی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اس طرح باتیں کرنی شروع کیں جیسے کوئی کسی روٹھے کو مناتا ہے۔ کبھی منہ سے منہ ملاتا۔ کبھی اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتا۔ گدگدیاں کرتا۔ وہ نام لے لے کر پکارتا۔ جس سے وہ خوش ہوتی تھی مگر اس کے چہرہ پر نہ مسکراہٹ آئی نہ

نہ تیور پر بل۔ سننے والے کان، دیکھنے والی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ محبت کے سرمدی گیت سننے میں ایسی محو ہے کہ اس دنیا کی کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔ حسن شباب کی گود میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ محبت لوریاں دے رہی تھی۔ احمد کے زخمی دل کو کون دیکھتا اور اس کے نوحے کون سنتا۔

اسی اثنا میں نیا وزیر اعظم ابو مجد اور مسرور جلاد دونوں آ گئے تھے۔ خلیفہ ادریسی انیس کی لاش اور احمد کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا اور اب اس کی باری تھی کہ وہ اپنے ضمیر کو حساب دے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے بھی ایک خون کیا ہے۔ اپنے محسن کی جان لی ہے۔ قانون حکومت کا گنہگار نہ سہی۔ دنیا نہ جانے، نہ دیکھے مگر عالم الغیب کو ہر بات کا علم ہے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس نے دوست بن کر دشمنی کی۔ ہمدردی کے پردہ میں دغا دی۔ سفید جھوٹ بول کر محبت کے گلے پر چھری پھیری۔ اسے یقین تھا کہ احمد کا دل انیس کی محبت سے خالی نہیں۔ وہ اس کا پجاری ہے۔ ہاں۔ اظہار محبت کا طریق پرستاری کی جو وضع اس نے اختیار کی تھی وہ ضرور انوکھی تھی۔ اچھا اب؟ گزرا ہوا وقت اور چھوٹا ہوا تیر واپس نہیں آیا کرتا۔ گزشت آنچہ گزشت۔ انیس زندہ نہیں ہو سکتی کہ تلافی مافات کرے۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ حکومت کے معاملات سے فرصت پانے کے بعد ضرور احمد کی دلجوئی میں کوشش کرے گا۔ اور اگر مصلحت ہوئی تو اصل واقعات بھی اس کے سامنے دہرا دئے جائیں گے۔ حکمرانوں کو بڑی مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔ ہزاروں بہات ضمیر کے خلاف سرانجام دینی پڑتی ہیں۔ سیاست اور ایمان اگر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو یا وہ حکومت فردوسی ہے یا "اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند"۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ ادریسی نے اس کے بعد احمد کے ساتھ کیا سلوک کیا اور انیس کی روح کو کہاں تک سکون نصیب ہوا۔

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی　　　　کتبہ عبدالحفیظ دہلوی

اتاترک : — لائبریری ایڈیشن

کتب خانہ علم وادب دہلی کا تاریخی شاہکار

یہ وہ منفرد اور معرکہ آرا کتاب ہے جس سے بہتر کتاب غازی مصطفےٰ کمال اتاترک بانی جمہوریہ ترکیہ کے حالات پر آج تک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ انجمن ترقی اردو ہند کا مشہور رسالہ اردو (مورخہ جولائی ۱۹۳۹ء) اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے۔

"اس کتاب میں محمد مرزا صاحب دہلوی نے اتاترک غازی مصطفےٰ کمال کے حالات زندگی بڑی محنت اور غائر مطالعے کے بعد لکھے ہیں۔"

اور یہ غازی اعظم کی تمام و کمال سوانح عمری ہے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو اور اس کے ہر کارنامے سے بحث کی ہے اردو میں اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ایسی جامع کتاب ابتک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی تھی۔" ہندوستان کا مشہور رسالہ "نگار" اس کے متعلق لکھتا ہے۔

یہ کمال اتاترک پر آخرین تصنیف ہے جس میں ان کے جانشین عصمت انونو کے حالات زندگی بھی جمع کر دئے گئے ہیں۔ فاضل مولف نے اس میں کمال اتاترک کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس پر نہایت جامعیت سے روشنی نہ ڈالی ہو۔

حجم ۳۰۰ صفحات اتاترک اور ترکی مشاہیر کی (۲۶) بلاک کی تصاویر ۔۔۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت اعلیٰ ٹائٹیل نہایت ہی دلکش اور دیدہ زیب مجلد

قیمت صرف دو روپے (عہ) علاوہ محصولڈاک

کتب خانہ علم وادب دہلی سے منگائیے

لالہ رُخ مصوّر۔ لائبریری ایڈیشن

کتب خانہ علم وادب کا ادبی کارنامہ

انگلستان کے مشہور شاعر طامس مور کی مثنوی جو خالص مشرقی تصورات اور نازک تخیلات عشق پر مبنی ہے تین ہزار گنی دے کر لانگ مین کمپنی نے اسے شائع کیا تھا اور تمام انگریزی داں طبقہ اس کو دیکھ کر چونک پڑا تھا۔ افسانے کا پلاٹ رومان اور طلسم کی ایسی دنیا میں آپ کو پہنچادے گا کہ آپ خود اس قصہ کا ایک کردار بننا پسند کریں گے۔ مُقنّع (نقاب پوش پیغمبر) "آتش پرستاران فارس"۔ "پری اور بہشت" اور "نور محل" چار قصے ہیں۔

ترجمہ ملک کے نامور ادیب ل۔ احمد اکبر آبادی نے کیا ہے۔ کتب خانہ علم وادب نے اس کو مصور چھاپنے کے لئے تقریباً تین درجن آرٹ کی بہترین تصاویر کا اہتمام کیا ہے جو اس کے ایک ناپید ولایتی ایڈیشن سے خاص طور پر زر کثیر خرچ کر کے حاصل کی گئی ہیں اردو میں ایسی بے مثل کتاب نہیں چھپی۔ بہترین کاغذ۔ بے پناہ ادب درومان۔ دل نشین تصاویر اور دیدہ زیب آرائش کے ساتھ اس نادر ادبی کارنامہ کو شائع کیا گیا ہے۔

مانگ کی کثرت کے باعث آرڈر جلد دیجئے۔ خدا معلوم دوسرا ایڈیشن چھپنے کی کب نوبت آئے۔

قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصولڈاک

کتب خانہ علم وادب دہلی سے منگائیے

دوشیزۂ صحرا

صحرائے عرب کی خوں آشام زہرہ کا فسانہ محبت

اس پُرفسوں وسحر خیز داستان میں مصنفہ نے سرزمین حسن کا ایک انوکھا قصۂ عشق سُنایا ہے جس میں محبت ونفرت، خشم وانتقام، ظلم وستم اور جنگ وجدل کبھی آپ کے رونگٹے کھڑے کردیں گے اور کبھی حسن کی سرگوشیاں، عشق کی کارفرمائیاں اور رقابت کی صعوبتیں آپکو انگشت بدنداں کردیں گی۔

بنت شیخ کی تعیش گاہ، اجڑی ہوئی خانقاہ کی الوہیت، سیتن کی جرأت ومردانگی، رالف کا پیمانِ وفا، الاسد کا جنونِ رقابت، نابینا یوسف کا لرزہ براندام کردینے والا انتقام، اور حسین وجمیل زہرہ کا ــــــ جس کی دہشتناک خونریزی اور بے پناہ قتل وغارت سے ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ کانپ اٹھتا ہے ــــــ سیتن کے محبوب کی الفت میں گرفتار ہونا، مگر حصولِ مقصد میں ناکام ومایوس ہوکر کوہ وصحرا کو پاؤں تلے روندتے ہوئے فرارشدہ محبت ومحبوب کو تہ تیغ کردینے کی کوشش کرنا...... یہ سب چیزیں آپ کو ایک نئی دنیا میں لے جائیں گی۔

اس ناول کو پڑھ کر آپ عرب اور عرب کے جنگجو لوگوں کے جملہ حالات مثلاً ان کے رسم ورواج، انکی مہماں نوازی، عادات وخصائل، بہادری اور جرأت، فنونِ حرب سے آگاہی، رہنے سہنے کے طریقے، مذہب ومعاشرت وغیرہ وغیرہ سے بخوبی واقف ہوجائیں گے۔ اسکی مصنفہ مس جون کونگر بنسٹ ہیں، جنہوں نے ایک عرصہ تک عرب میں رہکر اور وہاں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرکے اس کو قلم بند کیا تھا۔ اور اب اسے اردو کے مشہور ادیب ومترجم مسٹر صادق الخیری ایم۔اے دہلوی نے نہایت دلکش اور دلفریب اسلوب میں ہماری زبان کا جامہ پہنایا ہے۔ کتابت طباعت بہترین، سرورق نہایت خوشنما، قیمت مجلد ۲/۸ علاوہ محصول ڈاک:- پتہ:- کتب خانہ علم وادب دہلی

سات تارے

ایک ہی پلاٹ پر سات مشہور افسانہ نگار صاحبان ایم اسلم قیسی رامپوری۔ شاہد احمد فضل حق قریشی۔ انصار ناصری۔ اشرف صبوحی۔ ابوطاہر داؤد۔ کے شاہکار افسانے۔ ہر افسانہ کچھ ایسے پیرایہ میں لکھا گیا ہے کہ اچھوتا معلوم ہوتا ہے۔ ہر افسانہ نگار نے اپنی انشاپردازی کا سارا زور صرف کر دیا ہے اس ہفت رنگ مجموعہ میں اب لطف کا کمال دیکھئے۔ پلاٹ ایک ہی ہے لیکن ہر افسانہ نگار کی جنبش قلم نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کہانی بالکل نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ حسن کاری کا ایسا نادر مجموعہ آپ کو غیر زبانوں میں بھی نہیں مل سکتا۔

مضامین فراق

حضرت خواجہ سید ناصر نذیر صاحب فراق مرحوم جانشین حضرت خواجہ میر درد کے اڈیشن مختلف العنوان ادبی مضامین کا بیمثل مجموعہ ۱۶۰ صفحوں پر۔ تین رنگ کا دیدہ زیب ٹائٹل پیج کاغذ سفید چکنا۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

فراق صاحب کی دوسری تصانیف یعنی دکن کی پری۔ دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ۔ سات طلاقنوں کی کہانیاں۔ بیگموں کی چھیڑ چھاڑ وغیرہ اور بھی ہیں مگر مضامین فراق کے اڈیشن ابواب میں آپ کو انیس قسم کے ادبی مضامین نظر آئیں گے۔

خواب پریشان

مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن کا ایک طبعزاد افسانہ جس میں انہوں نے دلی کی نفیس زبان میں ایک حکیم صاحب کا دلچسپ قصہ لکھا ہے اور یہ مصنف نے اپنا ایک خواب حکیم صاحب کو سنایا ہے۔ خواب میں دیکھا ہے کہ یونان کے تمام اساتذہ اپنی اپنی قبروں سے اٹھے ہیں اور انہوں نے ہندوستان کے ایک مشہور فلسفی و منجم کو باغی قرار دیکر اس پر پھانسی کا حکم جاری کیا ہے۔ یہ خواب بجائے خود ایک نہایت عالمانہ چیز ہے۔ طبعزاد مزاح کی ہلکی ہلکی چاشنی نے اور بھی لطف پیدا کر دیا ہے۔ قیمت ۴ر

خطوط کی ستم ظریفی

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے یہ بہترین افسانہ اپنے مخصوص رنگ میں لکھا ہے۔ پلاٹ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے اور ساتھ ہی حیرت و استعجاب کی لہریں

دل و دماغ میں دوڑ جائیں گی۔ یہ صرف کتاب نہیں ہنسنے ہنسانے کا مستقل ذریعہ ہے۔ بہترین کتابت طباعت کے ساتھ خوبصورت ترین سرورق پیش کی گئی ہے۔ قیمت صرف ۸؍

کھرپا بہادر

مرزا عظیم بیگ نے اس ناول میں ایک عجیب و غریب قصہ پیش کیا ہے۔ ایک بدمعاش لفنگے کی سرگزشت سے اس ناول کی ابتدا ہوتی ہے۔ روزانہ اس کے سر پر پولیس والوں کے جوتے پڑتے ہیں اور کئی دفعہ سزا بھی پاتا ہے۔ اس بدمعاش کی شادی ایک نواب صاحب نے دھوکے میں آکر اپنی بھتیجی اور بیاہتا لاڈلی بیٹی سے زبردستی کر دی اور اُسے کھرپا بہادر کا خطاب دیا۔ اس بدمعاش پر شاہی محلات میں جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ الف لیلیٰ کے سوتے جاگتے (ابوالحسن) کے قصے سے بھی زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز ہے۔ اسی ناول میں ریاست کے ساتھ ساتھ ریاست کفتہ و کے غمناک واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک بیگم پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے ہیں یہاں تک کہ اُسے کو اکمنی بنا دیا جاتا ہے محلات کی جگمگاتی فضا میں آپ عجیب عجیب رنگینیاں دیکھیں گے۔ کہیں ہنسی اور کہیں قہقہے۔ کہیں آنسو اور کہیں خون کی بوندیں "کھرپا بہادر" کو پڑھ کر آپ شرارت کے "دربار حرام پور" کو بھول جائیں گے۔ تمام ناول ڈیڑھ سو نہایت دلفریب صفحات کی کتاب ہے اور قیمت ایک روپیہ عہ؍ علاوہ محصول ڈاک۔

فاؤسٹ

فاسٹ اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم و مسحور کن طریق کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ فاؤسٹ وہ آئینہ ہے جس میں زمانہ کے انسان کو اپنی صورت نظر آتی ہے۔ شہرہ آفاق شاعر المانیہ گوئٹے نے دنیا کی اس بلند ترین فلسفیانہ نظم میں اپنی عمر کے ساٹھ سال صرف کئے تھے۔ اس کہانی میں فلسفہ نفسیات کے مسائل کو شاعرانہ آرٹ کا لباس پہنا کر پیش کیا گیا ہے اس میں آپ زندگی کا وہ خواب دیکھیں گے جو بیک وقت سہانا بھی اور بھیانک بھی "فاؤسٹ" فلسفی کی عقل اور شاعر کے تخیل کی آخری حد ہے۔ نیکی بدی کا حسن، عشق، گناہ، خون، قتل اور موت کی رنگین داستان کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے۔

قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ؍)

دلّی کا اجڑا ہوا لال قلعہ

سید ناصر نذیر فراق مرحوم دلی کی ٹکسالی زبان لکھنے میں کمال رکھتے تھے۔ ان کا ایک ایک لفظ دل میں کھُب جاتا ہے۔ اس کتاب میں حضرت ابوظفر آخری تاجدار دہلی کے فرزند مرزا شاہرخ کے اس شکار کے حالات درج ہیں۔ جب آپ دہلی سے کجلی بن گئے تھے۔ یہ واقعات دلچسپ اور بعض عجیب و غریب ہیں یہ مٹی ہوئی بادشاہت کی ایک جھلک ہے جسے دیکھ کر عبرت کے دو آنسو ٹپک ہی پڑتے ہیں۔ قیمت ۴ر

سات طلاقنوں کی کہانیاں

یہ بھی فراق صاحب مرحوم کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں۔ سات طلاقنیں اتفاق سے ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں اور اپنی اپنی داستان حیات بیان کر کے بتاتی ہیں کہ انہیں کس وجہ سے طلاق ملی۔ اس کتاب میں عورتوں کی زبان لائق قدر ہے۔ طلاقنوں کے واقعات اس قدر دلچسپ ہیں کہ کتاب ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ قیمت ۴ر

بیگموں کی چھیڑ چھاڑ

یہ بھی فراق مرحوم کی تصنیف ہے۔ دلّی میں ایک بیاہ کی محفل کا جو نقشہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ کچھ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک بیگم کی زبانی سب واقعات بیان کرائے گئے ہیں۔ ٹکسالی اردو اور پھر وہ بھی دہلی کی شریف بیگمات کی فصیح بول چال ایک ایسی جنس ہے جو نایاب ہو چکی ہے۔ شادی کی محفلیں اردو لٹریچر میں کثرت سے پیش کی گئی ہیں۔ مگر زبان نے جو لطف اس محفل میں پیدا کر دیا ہے وہ کہیں اور میسر نہیں آ سکتا۔ قیمت چار آنے (۴ر)

دکن کی پری

حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق مرحوم نے اپنے خاص انداز میں یہ طویل افسانہ لکھا تھا جو شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ یہ کتاب برسوں سے ناپید تھی اب نئے انداز میں نہایت عمدہ کتابت و طباعت اور رنگین ٹائیٹل کیساتھ شائع کی گئی ہے زبان اور بیان کی خوبیاں قابل مطالعہ ہیں۔ قیمت چھ آنے (۶ر)

محبت اور نفرت

تہدیۂ محبت — نفرت کے نام

اردو کے سب سے جدت طراز ادیب اختر حسین رائے پوری کے سولہ رومانوں اور افسانوں کا مجموعہ۔
محبت ایک کانٹا ہے چبھنے کے لئے
نفرت ایک پھول ہے سونگھنے کیلئے۔ قیمت ۱۲ر

گمنام عورت کا خط

یہ استفہان زودیگ کے افسانہ کا ترجمہ ہے جو مسٹر ظفر قریشی بی اے دہلوی نے کیا ہے مصنف سویڈن کی اس مشہور علمی و ادبی انجمن کا رکن رہ چکا ہے جو "نوبل پیس پرائز" کے نام سے ہر سال انعامات عطا کرتی ہے۔ یہ افسانہ یورپ و امریکہ میں بہت مشہور ہو چکا ہے۔ یہ حسن و عشق کی ایک دردناک کہانی ہے جسے پڑھ کر حسن سوگوار اور عشق نامراد کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ عورت کی محبت جس انداز سے اس افسانہ میں پیش کی گئی ہے آج تک کسی اور افسانہ میں نہیں دیکھی گئی ترجمہ بھی نہایت سلیس و شگفتہ ہے۔ قیمت ۴ر

انکشاف حقیقت

صادق الخیری صاحب بی اے کا یہ افسانہ "ساقی" کے سنہ ۱۹۳۲ء کے افسانہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے، جو دیگر افسانوں کی طرح "ساقی" کے مجوزہ پلاٹ پر لکھا گیا تھا اور بہت زیادہ پسند کیا گیا تھا اس لئے اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے اس افسانہ کا شمار صادق صاحب کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ زبان و بیان کی خوبیاں ان کے اس افسانہ میں خوب نکھری ہوئی نظر آتی ہیں، اور ہر ہر سطر دل و دماغ پر ایک روحانی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ قیمت ۴ر

تماشہ پہ تماشہ

ملک کے مشہور ظرافت نگار جناب ناکارہ حیدرآبادی کا یہ افسانہ ایک طویل خط کی صورت میں ہے۔ افسانہ کا پلاٹ حد درجہ دلچسپ ہے اور ساتھ ہی طرز بیان کی شوخی اور چھوٹے چھوٹے جملوں کی پرجوش ظرافت ہنسائے بغیر نہیں رہتی افسانہ اپنے منتہا پر پہنچکر عجیب و غریب صورت اختیار کر لیتا ہے اور ساتھ ہی اس کی دلچسپی بھی معراج کو پہنچ جاتی ہے۔ قیمت ۴ر

عروس ادب

قاضی عباس حسین صاحب کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جو بہت پسند کیا گیا ہے۔ ہر افسانہ سیدھی سادھی اردو میں لکھا گیا ہے۔ واقعات تمام معاشرتی اور اصلاحی ہیں، پلاٹ بہترین، ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ قیمت عمر

چار انقلابی

جس میں غیر معمولی دل و دماغ والا انسان ڈاکٹر نیلم ایشا کی چار زبردست طاقتوں سے ٹکر لیتا ہے۔ مقابلہ کی زبردست روئداد سے جو پلاٹ بنا ہے۔ وہ بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ۸ر

معاشقۂ نپولین

فرانس کے مشہور جنگ جو سپہ سالار اور شہنشاہ نپولین بوناپارٹ جس نے کامل بیس برس تک یورپ میں تہلکہ مچا رکھا اور اپنی زندگی میں چھ سو کے قریب چھوٹی بڑی لڑائیاں فتح کی تھیں یہ اس کی حیات معاشقہ ہے۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ ۲ر

حیات مومن

مشہور شاعر حکیم مومن خاں کے حالات زندگی اور ان کے کلام پر تنقید اپنے موضوع پر پہلی کتاب از عرش گیاوی۔ قیمت عـہ ر

مراۃ العروس

کاغذ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت بارہ آنے ۱۲۔ و آٹھ آنے (۸ ر)

بنات النعش

قیمت بارہ آنے (۱۲ر) و آٹھ آنے (۸ ر)

کاغذ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔

توبۃ النصوح

قیمت عـہ ر و ۱۰ر کاغذ لکھائی چھپائی دیدہ زیب

مندرجہ بالا تینوں کتابیں اس کثرت سے مروج ہیں کہ کسی مزید تقریب کی ضرورت نہیں۔ بازار کثرت سے سستی قیمت پر ملتی ہیں۔ مگر نہ خط اچھا نہ کاغذ اچھا۔ ہمارے خاص اہتمام اور نگرانی سے چھپوائی ہوئی۔ کاغذ سفید چکنا لکھائی چھپائی دیدہ زیب اور فٹ نوٹ میں تمام الفاظ کے معنی

منتخب الحکایات

بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی دلچسپ نتیجہ خیز کہانیاں صـ تقطیع ۲۰/۲۲۔ قیمت ۸ر

چند پند

مفید و نصیحت آمیز مختلف مضامین کا مجموعہ بچوں کے لئے صـ تقطیع ۲۰/۲۲۔ قیمت ۸ر

افسانۂ پدمنی

رانی پدمنی سے سلطان علاؤ الدین کے عشق و اشتیاق کی داستان اور اس کی دلچسپ مورخانہ تحقیق و تنقید:۔ یہ ایک تاریخی خدمت ہے اس قابل ہے کہ کثرت سے پڑھا جائے" صدر یار جنگ بہادر (۱۱ر جنوری ۱۹۴۰ء) علیگڈھ۔

یہ کارنامہ اس قابل ہے کہ تاریخ کے نصاب میں جگہ پائے" (رسالہ ساقی) دہلی۔ مفصل دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے امید کہ اردو پبلک اس قیمتی کتاب کی قدر کریگی" (رسالہ ادبی دنیا) دلیلیں اس قدر قوی ہیں کہ ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا طرز بیان نہایت دلکش ہے" (رسالہ طلوع اسلام) قیمت عمہ

کتب خانہ علم وادب دہلی